سلاطینِ دہلی و شاہانِ مغلیہ

کا

ذوقِ موسیقی

پروفیسر محمد اسلم

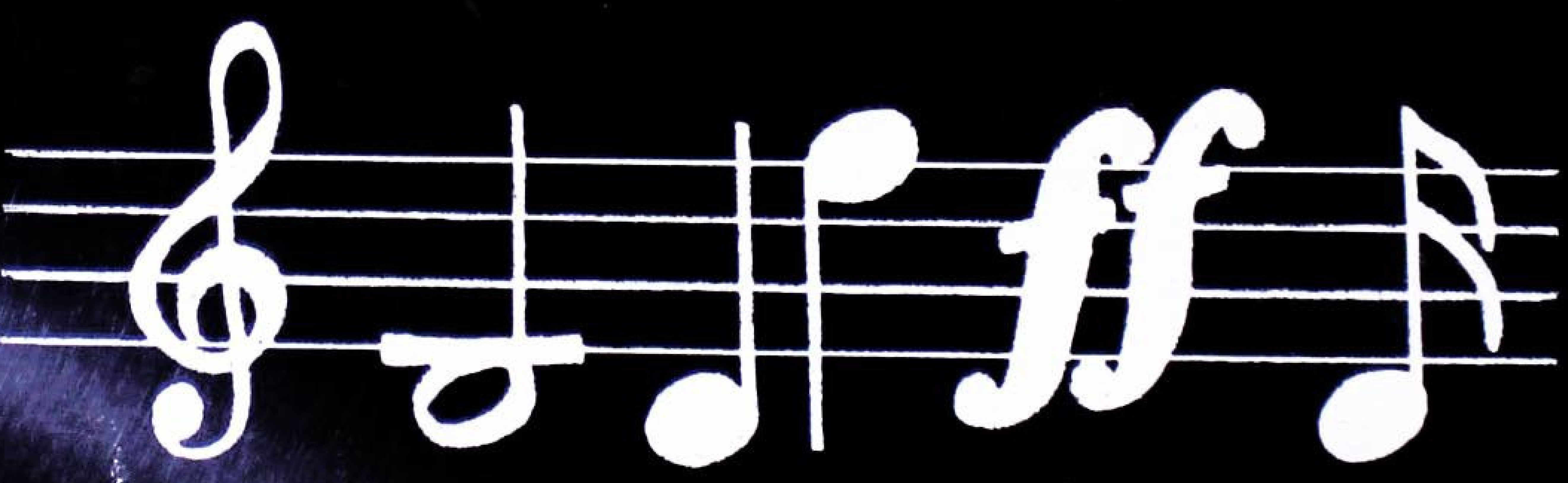

یکے از مطبوعات

شعبۂ تاریخ پنجاب یونیورسٹی لاہور

Collection of Prof. Muhammad Iqbal Mujaddidi
Preserved in Punjab University Library.

پروفیسر محمد اقبال مجددی کا مجموعہ
پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ شدہ

ذخیرۂ پروفیسر محمد اقبال مجددی

جو 2014ء میں پنجاب یونیورسٹی لائبریری کو

ہدیہ کیا گیا۔

CALL NO
PUNJAB UNIVERSITY LIBRARY
LAHORE

سلاطینِ دہلی و شاہانِ مغلیہ

کا

ذوقِ موسیقی

پروفیسر محمد اسلم

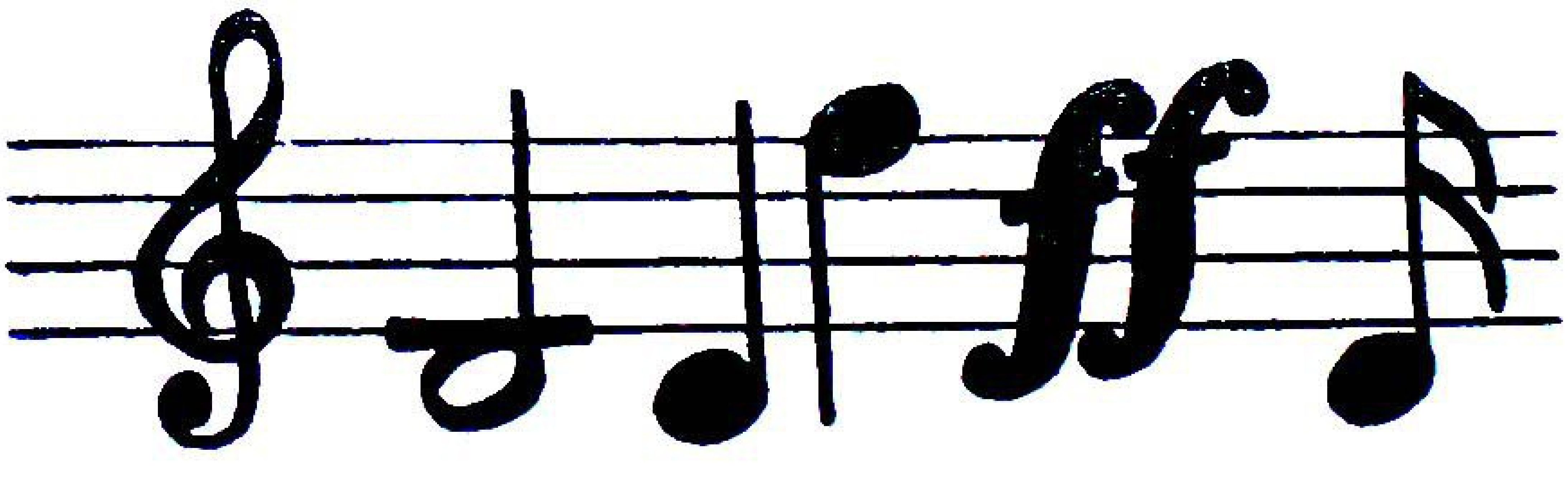

یکے از مطبوعات

شعبہ تاریخ پنجاب یونیورسٹی لاہور

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

13534

مصنف : پروفیسر محمد اسلم

ناشر : شعبۂ تاریخ ، پنجاب یونیورسٹی ۔ لاہور

تعداد : ۳۰۰

قیمت : ۵۰ روپے

تاریخ طباعت : نومبر ۱۹۹۲ء

طابع : اظہر سنز پرنٹرز ۸۵ ۱ - لٹن روڈ ، لاہور

انتساب

میں اپنی اس تصنیف کو برادرِ عزیز ماہرِ موسیقی
پروفیسر مجتبیٰ احمد علوی
شعبۂ تاریخ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

اور

جنابِ محترم شیخ مسعود احمد صاحب
انچارج میوزک سیل
ریڈیو پاکستان ، لاہور
کے نام معنون کرتا ہوں

پیش لفظ

ستمبر ۱۹۹۲ء کے اوائل میں راقم الحروف ایک کام کے سلسلے میں پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر جنابِ محترم ڈاکٹر منیر الدین چغتائی کی خدمت میں حاضر ہوا ۔ اتفاق سے اس وقت میرے تلمیذِ رشید اور اکیڈیمک سٹاف ایسوسی ایشن پنجاب یونیورسٹی کے صدر سید قمر عباس بھی وہاں موجود تھے ۔ دورانِ ملاقات راقم نے عرض کیا کہ سیدِ موصوف ایم ۔ اے تاریخ کے طلبہ کو پانچ لازمی پرچوں میں سے ایک پرچہ پڑھاتے ہیں ۔ اس پرچے کے نصاب میں سلاطین دہلی اور مغلیہ دور حکومت کا فن تعمیر ، مصوری ، خطاطی اور موسیقی شامل ہیں ۔ فن تعمیر ، مصوری اور خطاطی کے موضوعات پر تو بہت سی کتابیں مل جاتی ہیں لیکن موسیقی کے موضوع پر ہمارے پاس کوئی کتاب نہیں ہے ، اس لیے طلبہ کو بڑی دشواری پیش آتی ہے ۔ قمر عباس صاحب نے جناب وائس چانسلر کو بتایا کہ راقم نے موسیقی کے موضوع پر کئی مضامین لکھ کر مختلف رسائل میں شائع کرائے ہیں اور بھارت کی اندرا میوزک یونیورسٹی

خیر آباد ، مدھیہ پردیش سے ”اے ہینڈ بک آف انڈین میوزک“ کے عنوان سے ایک کتاب شائع ہوئی ہے جس میں راقم کا بھی ذکر آیا ہے کہ یہ کلاسیکی موسیقی پر لکھتا رہتا ہے ۔ راقم نے موقع دیکھ کر جناب وائس چانسلر کی خدمت میں عرض کیا کہ اگر ان تمام مضامین کو شائع کر دیا جائے تو طلبہ کی ایک بڑی مشکل حل ہو جائے گی ۔ انھوں نے فرمایا کہ شعبہ تاریخ کا مجلہ اسی موضوع کے لیے مختص کر دیں اور اس کی کتاب بنا دیں ۔ یوں بغیر کسی خرچ کے کتاب تیار ہو جائے گی ۔ جناب وائس چانسلر صاحب کا اشارہ پا کر راقم نے تمام مضامین جمع کیے امیر خسروؒ پر مضمون لکھنا باقی تھا ، وہ لکھا اور ابتدایہ تیار کیا ۔ اب یہ کتاب قارئین کرام کے ہاتھوں میں ہے ۔ اس کی اشاعت کے لیے راقم جنابِ محترم وائس چانسلر صاحب کا صمیمِ قلب سے شکر گزار ہے ۔

اورنگ زیب عالمگیر کے بارے میں یار لوگوں نے یونہی یہ بات مشہور کر دی ہے کہ انھیں موسیقی کے ساتھ نفرت تھی اور ان کے عہد میں موسیقار بھوکوں مرنے لگے تھے ۔ منوچی لکھتا ہے کہ ایک دن موسیقار اور سازندے جھوٹ موٹ کا جنازہ لے کر شاہی محل کے قریب سے آہ و بکا کرتے ہوئے گزرے تو اورنگ زیب عالمگیر نے اپنے ایک مصاحب سے دریافت کیا کہ یہ کس کا جنازہ ہے ؟ اس نے دست بستہ عرض کیا : ”موسیقی کا“ ۔ اس جواب پر اورنگ زیب عالمگیر ہنس دیا اور اس نے موسیقاروں کو کہلوا بھیجا کہ اس مردود مردے کو خوب گہرا کرکے دفن کریں تاکہ پھر باہر نہ نکل پڑے ۔ یہ بات اس شد و مد کے ساتھ دوہرائی گئی ہے کہ ہر شخص کو منوچی کی بات پر یقین ہو گیا ۔ جب راقم نے اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں موسیقی اور

موسیقاروں پر تحقیق شروع کی تو معلوم ہوا کہ موسیقی کو جس قدر فروغ ان کے عہد حکومت میں ہوا ویسا اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا۔ راقم نے یہ مضمون لکھ کر جناب مالک رام کی خدمت میں بھیجا اور انہوں نے شکریے کے ساتھ اسے "نذرِ مختار" میں شامل کر لیا۔

قرونِ وسطیٰ میں لوگ موسیقی کو ایک علم سمجھ کر سیکھتے تھے۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ گانے والے کی آواز سن کر بتا دیتے تھے کہ وہ کونسا راگ گا رہا ہے۔ ان کے فرزندِ ارجمند شاہ عبدالعزیز نے فن موسیقی پر "سانگیت شاستر" کے عنوان سے ایک رسالہ تحریر فرمایا تھا جس کا مخطوطہ رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہے۔ شاہ عبدالعزیز کو اس فن میں اتنا درک تھا کہ جب دہلی کے گویوں میں کسی راگ کی ادائیگی کے مسئلے پر اختلاف ہوتا تھا تو وہ رفعِ اختلاف کے لیے شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ شاہ عبدالعزیزؒ کے ملفوظات میں اس طرح کے کئی واقعات درج ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ موسیقی ایک فن تھا جسے اہل علم سیکھتے تھے۔ اس زمانے میں علم کے طور پر موسیقی کے رموز و اسرار سے واقفیت کو برا نہیں سمجھتے تھے۔ موسیقی اس وقت بدنام ہوئی جب یہ "کوئے ملامت" میں پہنچی اور کنچنیوں نے اسے بطور پیشہ اختیار کیا۔

میں آخر میں ایک بار پھر جناب وائس چانسلر کا دل کی گہرائیوں سے شکر گذار ہوں کہ انہوں نے اس کتاب کی طباعت میں دلچسپی کا اظہار فرمایا اور یوں یہ کتاب منصۂ شہود پر آئی۔ مجھے امید ہے کہ ایم۔ اے تاریخ کے طلبہ کے علاوہ ایم۔ اے فائن آرٹس اور نیشنل کالج آف آرٹس کے طلبہ بھی اس

کتاب سے مستفید ہوں گے ۔

لاہور : یکم نومبر ۱۹۹۲ء

محمد اسلم

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا
ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا

(صفی لکھنوی)

قرونِ اولیٰ میں موسیقی اور موسیقار

دور جاہلیت میں عربی شاعری انتہائی بلندیوں کو چھو رہی تھی ۔ اس دور کے بعض شعراء اپنا کلام سازوں کے ساتھ گا کر سنایا کرتے تھے ۔ مشہور مستشرق پروفیسر آر ، اے ، نکلسن اپنی شہرۂ آفاق تصنیف A Literary History of the Arabs میں اس دور کے مشہور شاعر الاعشٰی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ بربط بجا کر اپنا کلام سنایا کرتا تھا[1] ۔ بیاہ شادی کے موقع پر دف بجانے کا بھی رواج تھا ۔ یہ روایت اسلامی عہد میں بھی برقرار رہی ۔ امام الہند شاہ ولی اللہ دہلوی (م ۱۷۶۲ء) اپنی مشہور تصنیف حجۃ اللہ البالغہ کے باب "صفۃ النکاح" میں تحریر فرماتے ہیں کہ نکاح اور زنا میں آواز اور دف کا فرق ہوتا ہے ۔ یہاں انہوں نے ایک حدیث نقل کی ہے جس میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

> "حلال اور حرام میں فرق یہی ہے کہ نکاح میں آواز اور دف ہوتی ہے ۔ نکاح کا اعلان کرو اور نکاح مسجدوں میں کرو اور اس موقع پر دف بجایا کرو[2]" ۔

حدیث سے یہ بھی ثابت ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ سے ہجرت کرکے مدینہ طیبہ پہنچے تو بچیوں نے دف بجا کر آنحضرتؐ کا استقبال کیا اور اس موقع پر یہ اشعار گائے[3] :

طلع البدر علینا من ثنیات الوداع
وجب الشکر علینا ما دعی للہ داع

---

[1] Nicholson, R.A; A Literary History of the Arabs, Cambridge 1962, p. 123.

[2] شاہ ولی اللہ ، حجۃ اللہ البالغہ ، مطبوعہ اصح المطابع ، کراچی ، ج ۲ ، ص ۲۷۲ ۔

[3] ایضاً ۔

بعض حضرات کا یہ خیال ہے یہ اشعار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی غزوۂ تبوک سے واپسی پر گائے گئے تھے کیونکہ ثنیات الوداع مکے سے مدینے آنے والے راستے پر نہیں بلکہ شام سے مدینے آنے والے راستے پر واقع ہیں ۔ اس اختلاف کے باوجود اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ اشعار بچیوں نے دف بجا کر گائے تھے ۔

سیرۃ عائشہؓ کے فاضل مصنف علامہ سید سلیمان ندویؒ الصحیح البخاری کی کتاب النکاح کے حوالے سے تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ نے ایک انصاری بچی کی پرورش کی تھی ۔ جب اس کی شادی کا وقت آیا تو ام المومنین اس تقریب کو سادگی کے ساتھ انجام دینے لگیں ۔ اتنے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو آپؐ نے فرمایا :

”عائشہ گیت اور راگ تو ہے نہیں[1]“ ۔

عرب کے بدو ہدی خوانی کے لیے مشہور تھے ۔ جب وہ یہ محسوس کرتے کہ اونٹ تھک کر سست رفتار ہوگئے ہیں تو وہ ہدی خوانی شروع کر دیتے اور ان کی آواز سن کر اونٹ تیز رفتار ہو جاتے ۔ ایک بار سرور کائناتؐ کسی غزوے سے فارغ ہوکر مدینہ طیبہ کی طرف واپس تشریف لا رہے تھے ۔ امہات المومنین بھی کجاوں میں سفر کر رہی تھیں ۔ کسی صحابی نے اونٹوں کو سست رفتار دیکھ کر ہدی خوانی شروع کر دی تو اونٹ دوڑنے لگے ۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو امہات المومنین کی تکلیف کا احساس ہوا تو آپؐ نے ہدی خوان کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا :

”یہ نازک آبگینے ہیں ۔ ان کا خیال رکھو“ ۔

ہدی خوانی سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسانوں کے علاوہ بے زبان جانور بھی موسیقی کی ”زبان“ سمجھتے ہیں اور وہ اس سے اثر قبول کرتے ہیں ۔ حضرت سید علی ہجویریؒ اپنی مشہور زمانہ تصنیف — کشف المحجوب — میں تحریر فرماتے ہیں کہ یہ ان کا مشاہدہ ہے کہ جب بلوچ گدھے اور اونٹ لے کر چلتے ہیں تو اثنائے سفر انہیں اپنے گانے سے مست کر دیتے ہیں[2] ۔ ایک دوسرے

---

۱ - سید سلیمان ندوی ، سیرت عائشہ ، مطبوعہ اعظم گڑھ ۱۹۶۸ء ، ص ۳۹۔

۲ - سید علی ہجویری، کشف المحجوب ، مطبوعہ ، لاہور ۱۳۹۳ھ ، ص ۶۱۱۔

موقع پر حضرت علی ہجویریؒ تحریر فرماتے ہیں کہ چند اونٹ تین چار روز سے پیاسے تھے ۔ جب انھیں کسی ندی کے گھاٹ پر پانی پلانے لے گئے تو ایک غلام نے گانا شروع کر دیا ۔ وہ اونٹ اس کی آواز سن کر شدت پیاس کے باوجود پانی پینا بھول گئے اور دیوانہ وار جنگل کی طرف بھاگ گئے[۱] ۔ صاحبِ کشف المحجوب فرماتے ہیں کہ خراسان اور عراق کے شکاری رات کے وقت تھال بجاتے ہیں جس کی آواز سن کر ہرن مست ہو کر آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور شکاری انھیں پکڑ لیتے ہیں ۔ انھوں نے یہ بھی سنا تھا کہ ہندوستان کے بعض علاقوں میں بھی ہرن پکڑنے کے لیے یہی طریقہ اپنایا جاتا ہے[۲] ۔

حضرت علی ہجویریؒ تحریر فرماتے ہیں کہ یہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ شیر خوار بچے اگر رو رہے ہوں ، تو وہ لوری سن کر چپ ہو جاتے ہیں ۔ اطباء کے نزدیک جو بچہ لوری سن کر چپ ہو جائے ، وہ زیرک ہوتا ہے ۔ حضرت علی ہجویریؒ نے بڑے پتے کی بات کی ہے کہ عقلاء کے نزدیک جس شخص پر آواز کی تاثیر نہ ہو، وہ بے حس ہے اور وہ جانداروں کے طبقہ سے خارج ہے[۳] ۔

مؤرخین لکھتے ہیں کہ دور جاہلیت میں عربوں میں گانے بجانے کا رواج تھا لیکن نزولِ قرآن کے بعد انھوں نے گانا بجانا ترک کر دیا اور وہ قرآن خوانی میں لذت محسوس کرنے لگے ۔ لبید بہت بڑے شاعر تھے ۔ انھوں نے دور جاہلیت بھی دیکھا تھا اور زمانہ اسلام بھی پایا تھا ۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں انھوں نے کوفہ میں سکونت اختیار کر لی تھی ۔ ایک بار حضرت عمر فاروقؓ نے گورنر کوفہ کو خط لکھا کہ لبید کا تازہ کلام انھیں بھجوایا جائے ۔ گورنر نے لبید سے استفسار کیا تو انھوں نے فرمایا کہ امیر المومنین کو لکھ دیجیے کہ جب سے انھوں نے قرآن پڑھنا شروع کیا ہے ، شعر کہنے چھوڑ دیے ہیں[۴] ۔ یہ قرآن کا اعجاز تھا کہ عربوں نے شاعری ترک کر دی ۔

اُموی دور میں جب اسلامی سلطنت کا دائرہ وسیع ہوا اور نئی نئی قومیں اسلام میں داخل ہوئیں تو وہ اپنے رسم و رواج اور تہذیب و ثقافت بھی کسی

---

[۱] ۔ ایضاً ، ص ۶۱۱ ۔

[۲] ۔ ایضاً ، ص ۶۱۱ ۔

[۳] ۔ ایضاً ، ص ۶۱۱ ۔

[۴] ۔ خورشید احمد فارق ، حضرت عمر فاروقؓ کے سرکاری خطوط ، مطبوعہ دہلی ۱۹۷۹ء ، ص ۲۰۰ ۔

حد تک ساتھ لے آئیں ۔ اُدھر مذہب کی گرفت ذرا ڈھیلی پڑی تو حکمران تعیش کی زندگی بسر کرنے لگے ۔ الناس علی دین ملوکھم کے مصداق عوام بھی اسی رنگ میں رنگے گئے ۔ دوسرے فنونِ لطیفہ کے ساتھ موسیقی کو بھی فروغ ملا۔

طویس اس عہد کا ایک نامور موسیقار تھا ۔ دف بجانے میں اس کا کوئی ثانی نہ تھا ۔ ایک بار اس نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا تو اس قدر لوگ جمع ہوگئے کہ مکان کی چھت گر گئی اور طویس ملبے تلے دب کر مر گیا ۔ ابن مسجح نے مکہ مکرمہ جیسے مقدس شہر میں گانے بجانے کا پیشہ اختیار کیا ۔ اس نے کئی ملکوں کا دورہ کرکے تکمیلِ فن کی ۔ ابن سریج بھی اسی بلدالامین کا ممتاز گویا تھا[1] ۔ اس نے متعدد دھنیں تیار کیں جو عوام میں بڑی مقبول ہوئیں ۔ ابن محرز بھی مکہ مکرمہ کا نامور موسیقار تھا ۔ اس نے ابن سریج کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا تھا ۔ اس نے ایران و روم کا دورہ کرکے وہاں کے فنکاروں سے استفادہ کیا اور ایرانی اور رومی دھنوں کو عربی دھنوں میں شامل کر کے موسیقی کے ایک نئے دبستان کی بنیاد رکھی ۔ ابن سریج کے ایک اور شاگرد غریض نے اُمویوں کے آخری دور میں فنِ موسیقی میں بڑا نام پیدا کیا ۔ وہ شاہی درباروں اور عوام میں یکساں مقبول تھا ۔

دارالھجرۃ مدینہ منورہ بھی موسیقی سے محفوظ نہ رہ سکا ۔ وہاں کے ایک مغنی، سائب نے اُموی عہد میں بڑی شہرت پائی ۔ اس کا ایک شاگرد معبد اپنی شیریں آواز کے لیے بڑا مشہور تھا ۔ وہ مدینہ طیبہ کے تمام موسیقاروں کا امام تسلیم کیا جاتا تھا ۔ اسی مقدس شہر کی ایک مغنیہ جمیلہ نے فنِ موسیقی کے فروغ کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی ۔ اس نے حبابہ اور سلامہ نامی دو شاگرد تیار کیں جو خلیفہ یزید بن عبدالملک (م ۷۲۴ء) کی منظورِ نظر تھیں ۔

عباسی خلفاء میں سے مہدی (م ۷۸۵ء) نے سب سے پہلے موسیقی میں دلچسپی ظاہر کی ۔ مکہ مکرمہ کا مشہور مغنی سیاط اس کے دربار میں باریاب ہوا ۔ اس نے ابراہیم موصلی جیسا شاگرد تیار کیا ۔ اس کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ ایک بار تیس کنیزیں ساز بجا رہی تھیں اور وہ گا رہا تھا ۔ اس نے فوراً ایک کنیز کو روک کر کہا کہ وہ اپنے ساز کا تار کس لے۔ ابراہیم، ہارون الرشید

---

1. Zahur Anjum, *Social And Economic Conditions Under The Umyyads At Damascus*, M.A. Thesis, Deptt. of History, P. U. Lahore, P. 104

(م ۸۰۹ء) کا مصاحبِ خاص تھا اور وہ اپنے فن کا مظاہرہ کرکے لاکھوں درہم انعام پایا کرتا تھا ۔ اس کے علاوہ ابنِ جامی اور مخارق بھی ہارون الرشید کے دربار سے وابستہ تھے ۔ گانے والی کنیزوں کی تعداد شمار سے باہر تھی ۔ ابراہیم کا فرزند اسحاق موصلی (م ۸۵۰ء) عباسی عہد کا سب سے بڑا موسیقار تسلیم کیا جاتا ہے ۔ اس نے اس فنِ لطیف کی بڑی خدمت کی ۔

عباسی خلیفہ مامون الرشید (م۸۳۳ء) کے عہد خلافت میں اسحاق موصلی ہنوز بقیدِ حیات تھا ۔ اسی زمانے میں عریب اور بذل نامی مامون الرشید کی دو کنیزوں نے موسیقی میں بڑا نام پایا ۔ عریب نے متعدد راگ ایجاد کیے اور بذل نے فن موسیقی پر ایک کتاب لکھ کر اہلِ فن سے داد وصول کی ۔

عباسی عہد میں الکندی (م ۹۶۱ء) ، ابوبکر محمد بن زکریا رازی (م ۹۲۵ء) ، بو علی سینا (م ۱،۰۳۷ء) اور فارابی (م ۹۵۰ء) نے موسیقی کے موضوع پر کتابیں لکھیں ۔ فارابی خود اتنا بڑا موسیقار تھا کہ وہ ساز بجا کر کبھی لوگوں کو رُلا دیتا ، کبھی سُلا دیتا اور کبھی اتنا ہنساتا کہ سامعین کے پیٹ میں بل پڑ جاتے ۔

امام ابو حامد محمد غزالیؒ (م ۱۱۱۱ء) نے بھی موسیقی کے موضوع پر قلم اٹھایا اور اس کا جواز تلاش کیا جس سے صوفیاء کرام کو اپنی خانقاہوں میں محافلِ سماع منعقد کرنے میں آسانی ہوگئی۔ عباسی دورِ خلافت میں ہی ابوالفرج الاصفہانی نے کتاب الآغانی جیسی بلند پایہ کتاب لکھ کر عربوں کی موسیقی کو چار دانگ عالم میں مشہور کر دیا ۔ اندلس کے مشہور علم دوست حکمران حکم ثانی (م ۹۷۶ء) کو جونہی اس کا علم ہوا کہ اصفہانی فن موسیقی پر ایک کتاب لکھ رہا ہے تو اس نے ایک قاصد کے ہاتھ ہزار دینار اسے اس فرمائش کے ساتھ بھجوائے کہ اس کا پہلا نسخہ اسے بھجوایا جائے[1]۔ کتاب الآغانی اندلس میں مقبول ہوئی ۔ اندلس کے راستے عربوں کی موسیقی یورپ میں متعارف ہوئی ۔ سپین اور پرتگال کی موسیقی پر عرب موسیقی کی بڑی گہری چھاپ ہے ۔ جب

---

۱ ـ نصیر احمد ناصر ، ڈاکٹر ، تاریخ ہسپانیہ ، مطبوعہ ، لاہور ۱۹۶۹ء ، ص ۲۷۴ ۔

اہل سپین جنوبی امریکہ میں آباد ہوئے تو ان کے ذریعے عرب اثرات وہاں بھی پہنچ گئے۔

گوش مشتاق کی کیا بات ہے اللہ اللہ
سن رہا ہوں میں وہ نغمہ جو ابھی ساز میں ہے

(جگر مراد آبادی)

برعظیم پاک و ہند میں موسیقی کی ابتداء

آٹھویں صدی کے آغاز میں جب عربوں نے سندھ میں حکومت قائم کی تو انہوں نے دوسرے علوم و فنون کے ساتھ عرب موسیقی کو بھی یہاں متعارف کرایا۔ عباسی دور حکومت میں سندھ اور عراق کے درمیان تجارت اور آمد و رفت بڑھی تو دونوں علاقوں کے لوگ ایک دوسرے سے مستفیض ہوئے۔ عراق میں فن موسیقی میں ہونے والی ترقی کا اثر سندھ میں بھی محسوس کیا گیا۔ آج بھی سندھی موسیقی اور وہاں کے سازوں میں عرب اثرات محسوس کیے جا سکتے ہیں۔

بد قسمتی سے سندھ میں عربوں کا تین صدیوں کا شاندار دور حکومت اب تک ہماری نظروں سے اوجھل رہا۔ خدا بھلا کرے قاضی اطہر مبارکپوری کا، انہوں نے اس دور کی تاریخ و ثقافت پر آٹھ کتابیں لکھ کر ہمیں اس دور کی قدر و قیمت سے آگاہ کیا ہے۔ ان تین صدیوں میں شام و عراق میں علوم و فنون میں جس قدر ترقی ہوئی تھی اس کا اثر سندھ اور اس کے ماتحت علاقوں میں محسوس کیا جاتا تھا۔ عباسی دورِ خلافت میں جب سندھ اور عراق کے درمیان تجارت اور آمد و رفت بڑھی تو عراق میں سندھ کی تہذیب و ثقافت اور سندھ میں عراق کی تہذیب و ثقافت مقبول ہوئیں۔ اس کی تفصیل محترم قاضی اطہر مبارکپوری کی تصانیف میں مل جاتی ہے۔

جب دسویں صدی کے اختتام پر سندھ میں عربوں کی حکومت کا زوال شروع ہوا تو اسی زمانے میں افغانستان میں سبکتگین کی قیادت میں ایک نئی مسلم قوت اُبھر رہی تھی۔ سبکتگین نے افغانستان سے ہندو شاہی حکمرانوں کو پنجاب کی جانب دھکیل دیا اور اس کے جانشین محمود نے ہندوؤں کو پے در پے شکستیں دے کر ۱۰۲۱ء میں پنجاب کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ اس کے ساتھ ہی پنجاب میں مسلمانوں کی بستیاں قائم ہونے لگیں اور وسطِ ایشیاء سے علماء اور صوفیاء یہاں آ کر آباد ہونے لگے۔ حضرت

بہاء الدین زکریا کے جد امجد کوٹ کروڑ ضلع مظفر گڑھ میں ، بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ کے بزرگ کوٹھے وال ضلع ملتان میں ، حضرت اسمعیل محدث و مفسر اور سید علی ہجویریؒ لاہور میں سکونت پذیر ہوئے ۔

حضرت سید علی ہجویری نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف کشف المحجوب لاہور ہی میں تحریر فرمائی ۔ اس تصنیف دلپذیر کے آخری نو ابواب سماع سے متعلق ہیں ۔ راقم الحروف نے پیش لفظ میں وہیں سے چند مثالیں نقل کی ہیں ۔ جن دنوں حضرت سید علی ہجویریؒ سلوک کی ابتدائی منازل طے کر رہے تھے تو انھیں سماع سے بڑا شغف تھا ۔ ایک بار گرمی کے موسم میں حضرت ہجویری شیخ ابو المظفر کی خانقاہ میں پہنچے ۔ گرمی کی شدت سے صاحب کشف المحجوب پسینے سے شرابور ہو رہے تھے ۔ شیخ ابوالمظفر نے ان سے پوچھا "ابوالحسن ! کیا حال ہے جو اس قدر گھبرائے ہوئے ہیں ؟" انھوں نے جواب دیا "سرکار مجھے سماع کی خواہش ہے" ۔ حضرت ابو المظفر نے اسی وقت کسی خادم کو بھیج کر قوالوں کو طلب فرمایا ۔ ان کے ساتھ "اہل عشرت" کی ایک جماعت بھی آ گئی ۔ سماع شروع ہوئی تو ایک نوجوان نے سب کو مضطر کر دیا ۔ حضرت ہجویری پر بھی ایک خاص کیفیت طاری ہو گئی ۔ تھوڑی دیر بعد جب یہ حالت جاتی رہی تو شیخ ابو المظفر نے حضرت ہجویری سے دریافت فرمایا "اب تمہارا کیا حال ہے ؟" انھوں نے فرمایا "اب بہت سکون ہے" ۔ ان کا جواب سن کر شیخ ابوالمظفر نے فرمایا : "ایک وقت تجھ پر وہ آئے گا کہ یہ آواز سماع اور کوے کی کائیں کائیں تیرے لیے یکساں ہوگی ۔ اس لیے کہ سماع کا اثر صوفی کے قلب پر اسی وقت ہوتا ہے جب تک وہ مشاہدہ سے محروم ہے اور جب مشاہدہ حاصل ہو جاتا ہے تو اثر سماع بیکار ہو جاتا ہے ۔ خیال رکھنا کہ اس سماع کی عادت نہ ڈال لینا کہ یہ طبیعت ثانیہ بن کر تجھے مشاہدہ سے محجوب نہ کر دے" ۔ اس کے بعد حضرت ہجویریؒ پر وہ دور بھی آیا جب انھیں سماع سے نفرت ہو گئی اور انھوں نے برملا فرمایا "میں عثمان جلابی کا بیٹا علی اس کو دوست رکھتا ہوں جو سماع میں نہ پڑے اور طبیعت کو

---

۱ ۔ سید علی ہجویری ، کشف المحجوب ، مطبوعہ ، لاہور ۱۳۹۲ھ ، ص ۳۳۰ ۔

پریشان نہ کرے کیونکہ اس میں بڑے خطرے ہیں ۔"[1]

سلطنت دہلی کی بنیاد سلطان قطب الدین ایبک کے ہاتھوں ۱۲۰۶ء میں پڑی ۔ اس کے ساتھ ہی مشرقی پنجاب ، دہلی ، بدایوں اور اجمیر میں علماء اور صوفیاء نے سکونت اختیار کر لی ۔ سلطان شمس الدین التمش (م ۱۲۳۶ء) کے عہد حکومت میں جب قاضی منہاج سراج جزجانی صاحبِ طبقاتِ ناصری منصب قضاء پر فائز ہوئے تو ان کی وجہ سے دہلی میں سماع کا رواج پڑا ۔[2] وہ خود اہلِ سماع میں سے تھے ۔ قاضی حمید الدین نا گوریؒ حضرت شہاب الدین عمر سہروردیؒ کے صحبت یافتہ اور خواجہ قطب الدین بختیار کا کیؒ کے مصاحبِ خاص تھے ۔ انھیں بھی سماع سے خاص شغف تھا ۔ ان کی صحبت میں رہتے ہوئے خواجہ قطب الدین بختیار کا کیؒ کو بھی یہ شوق پڑ گیا ۔

ایک بار دہلی میں حضرت علی سجستانیؒ کی خانقاہ میں محفلِ سماع منعقد تھی ۔ اس محفل میں خواجہ قطب الدین بختیار کا کیؒ اور قاضی حمید الدین نا گوریؒ بھی شریک تھے ۔ اتفاق سے قوالوں نے حضرت احمد جام ژندہ پیل کا کلام سنانا شروع کیا ۔ جب وہ اس شعر پر پہنچے :

کشتگانِ خنجر تسلیم را
ہر زمان از غیب جانے دیگر است

تو خواجہ صاحب کے مزاج میں ایسا تغیر پیدا ہوا کہ بیہوش ہو گئے ۔ ان کے ساتھی انھیں ان کی قیام گاہ پر اٹھا لائے ۔ خواجہ صاحب کو جب ہوش آتا تو قوالوں سے پھر وہی شعر پڑھنے کی خواہش کا اظہار فرماتے ۔ جب وہ شعر کی تکرار کرتے تو خواجہ صاحب پر پھر وہی کیفیت طاری ہو جاتی ۔ شیخ عبدالحق محدث تحریر فرماتے ہیں کہ چار شب و روز ان پر یہی کیفیت طاری رہی اور اسی حالت میں انھوں نے ۲۱ دسمبر ۱۲۳۵ء کو اپنی جان جاں آفرین کے سپرد کر دی ۔[3]

---

[1] - شیخ محمد اکرام ، آب کوثر ، مطبوعہ لاہور ۱۹۵۲ء ، ص ۸۹ ۔

[2] - ایضا ۔ ص ۱۴۶ ۔

[3] - عبدالحق محدث ، اخبار الاخیار ، مطبوعہ دہلی ۱۳۳۲ھ ، ص ۲۶ ۔

خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اوشیؒ کی صحبت میں رہتے ہوئے ان کے مرید خاص اور خلیفۂ اعظم بابا فرید الدین گنج شکرؒ کو بھی سماع سے رغبت پیدا ہوگئی تھی اور موصوف کبھی کبھار سماع سے لطف اندوز ہوتے تھے ۔ ایک روز ان کی طبیعت سماع کی جانب مائل تھی لیکن کوئی قوال یا شعر خوان موجود نہ تھا ۔ سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس وقت بابا صاحب کے داماد اور خلیفہ بدر الدین اسحاقؒ حاضر خدمت تھے ۔ بابا صاحب نے ان سے فرمایا کہ وہ خطوط کا خریطہ اٹھا لائیں اور اس میں سے قاضی حمیدالدین ناگوریؒ کا مکتوب گرامی تلاش کر کے انھیں سنائیں ۔[1] شیخ عبدالحق محدث لکھتے ہیں کہ ابھی انھوں نے اتنی عبارت ہی پڑھی تھی : "فقیر حقیر ضعیف نحیف محمد عطاء کہ بندۂ درویشاں ست و از سر و دیدہ خاکِ قدمِ ایشاں" کہ بابا صاحب پر ایک خاص کیفیت طاری ہوگئی ۔[2] بابا صاحب کا تو یہ حال تھا کہ اگر کبھی ان کی طبیعت سماع کی طرف مائل ہوتی اور قوال میسر نہ آتا تو موصوف اپنے کسی مرید سے عوارف المعارف کی چند سطریں پڑھوا کر سنتے اور ان پر وجد طاری ہو جاتا ۔

حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ کے جانشین سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ دردمند دل رکھتے تھے ۔ ان کے ملفوظات فوائدالفواد میں کئی مواقع پر سماع کا ذکر آیا ہے ۔ حضرت سماع کو مردان قوی کی کسوٹی سمجھتے تھے ۔[4] ایک روز انھوں نے امیر حسن علاءؔ سجزی کے استفسار پر فرمایا کہ مشائخ کرام میں سے اہل درد سماع سنتے ہیں کیونکہ وہ اس کے اہل ہیں ۔[3] ایک روز جامع ملفوظات نے سلطان المشائخ کی خدمت میں عرض کیا کہ مشائخ کا ایک گروہ سماع کا منکر ہے اور وہ اسے حرام سمجھتا ہے ۔ سلطان جی نے مسکراتے ہوئے فرمایا کہ ان میں ذوق ہی نہیں ، اس لیے وہ سماع نہیں سنتے ۔[5] ایک محفل میں امیر حسن علاءؔ سجزی نے سلطان جی کی

---

۱ - امیر حسن علا سجزی ، فوائد الفواد ، مطبوعہ لاہور ۱۹۶۶ء ، ص ۲۵۴ -

۲ - عبدالحق محدث ، اخبار الاخیار ، ص ۳۷ -

۳ - امیر حسن علا سجزی ، فوائد الفواد ، ص ۷۵ -

۴ - ایضاً ، ص ۱۶۵ -

۵ - ایضاً ، ص ۳۸۶ -

خدمت میں عرض کیا کہ جب وہ سماع سنتے ہیں تو ان کی طبیعت میں رقت پیدا ہوتی ہے اور انھیں اس سے راحت ملتی ہے ۔ سماع کے دوران ان کے دل سے دنیاوی خواہشات نکل جاتی ہیں اور اہل دنیا کا خیال بھی دل میں نہیں آتا ۔[1] سلطان جی نے ایک روز حاضرین کو بتایا کہ سماع کے دوران عالمِ ملکوت سے روح پر انوار نازل ہوتے ہیں ۔[2]

جامع ملفوظات لکھتے ہیں کہ ان کے مرشد حضرت نظام الدین اولیاءؒ فرمایا کرتے تھے کہ سماع کی چار شرائط ہیں ۔ اولاً : سنانے والا مرد ہو ، عورت یا نو عمر لڑکا نہ ہو ۔ ثانیاً : کلام فحش نہ ہو اور ہزل سے مبرا ہو ۔ ثالثاً : سننے والا یادِ حق میں مشغول ہو کر سنے ۔ رابعاً ۔ سماع کے دوران چنگ اور رباب جیسے ساز نہ بجائے جائیں ۔[3] حضرت نے ارشاد فرمایا کہ ان شرائط کے ساتھ سماع حلال ہے ۔

حضرت بندہ نواز گیسو دراز فرماتے ہیں کہ ایک بار حضرت نظام الدین اولیاء کہیں تشریف لے جا رہے تھے کہ راستے میں ایک رہٹ چل رہا تھا ۔ حضرت والا قدر پانی پینے کے لیے اس کنوئیں پر رکے تو کسان نے اپنے بیلوں سے کہا : باہر ہو باہر ۔ اتنی سی بات سن کر حضرت کی حالت متغیر ہوگئی ۔ جب حضرت کے خدام میں سے خواجہ اقبال اور خواجہ مبشر نے اپنے مرشد کی یہ حالت دیکھی تو انھوں نے ان الفاظ کو بار بار دہرانا شروع کر دیا ۔ جب تک سلطان المشائخ اپنی منزل تک نہیں پہنچ گئے اس وقت تک وہ انہی الفاظ سے لطف اندوز ہوتے رہے[4] ۔

حضرت گیسو دراز سے ہی یہ روائت ہے کہ ایک بار ایسا ہوا کہ حضرت نظام الدین اولیاء اپنے حجرے میں تشریف فرما تھے کہ زیر دیوار ایک عورت نے پہلے سہیلہ اور پھر شبانہ گایا ۔ حضرت والا قدر بیحد خوش ہوئے اور

---

[1] ۔ ایضاً ، ص ۱۹۶ ۔

[2] ۔ ایضاً ، ص ۶۰ ۔

[3] ۔ ایضاً ، ص ۲۱۸ ۔

[4] ۔ سید محمد اکبر حسینی ، جوامع الکلم ، مطبوعہ کانپور ۱۳۵۶ھ ، ص ۱۵۰ ۔

انہوں نے اوپر سے ہی اپنا لحاف ، نہالی ، ایک کپڑا اور جو کچھ بھی ان کے ہاتھ آیا ، نیچے پھینک دیا ۔ وہ مغنیہ یہ چیزیں انعام سمجھ کر لے گئی ۔[1]

حضرت گیسو دراز فرماتے ہیں کہ جب حضرت نظام الدین اولیاء کی خانقاہ میں باؤلی کھودی گئی تو اس میں سے کھاری پانی نکلا ۔ خدام نے عرض کیا کہ اگر اس کا پانی میٹھا ہوتا تو لوگوں کو اس سے بڑا فائدہ ہوتا ۔ حضرت نے خواجہ اقبال سے کہا کہ وہ کسی روز محفل سماع میں انہیں یہ بات یاد دلائیں ۔ چند روز بعد محفل سماع منعقد ہوئی تو خواجہ صاحب نے وہ بات یاد دلائی ۔ حضرت نے قلم دوات اور کاغذ طلب فرمائے اور تعویذ لکھ کر خواجہ اقبال کو دیا کہ وہ اسے باؤلی میں ڈال دے ۔ تعویذ کا باؤلی میں ڈالنا تھا کہ اس کا پانی میٹھا ہوگیا ۔[2]

سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ ایک روز انہوں نے اپنے مرشد کے حجرے کے اندر جھانک کر دیکھا تو اُس وقت بابا فریدؒ ننگے سر تھے اور ان کے چہرے کا رنگ متغیر تھا ۔ بابا صاحب بار بار یہ رباعی پڑھتے :

خواہم کہ ہمیشہ در وفائی تو زیم
خاکی شوم و بزیر پائی تو زیم

مقصود من خستہ ز کونین توئی
از بہر تو میرم و برائے تو زیم

بابا صاحب یہ رباعی پڑھ کر سجدہ ریز ہو جاتے اور کبھی کھڑے ہوکر رقص کرنے لگتے ۔ سلطان المشائخ بڑی دیر تک یہ منظر دیکھتے رہے اور پھر ہمت کر کے حجرے میں داخل ہوگئے ۔ انہوں نے اپنا سر مرشد کے قدموں میں رکھ دیا ۔ بابا صاحب خدا جانے اس وقت کس عالم میں تھے ۔ انہوں نے سلطان جی کو مخاطب کر کے فرمایا : "بخواہ چہ می خواہی۔" (مانگو ! کیا مانگتے ہو) ۔ انہوں نے فوراً عرض کیا "من چیزے از نعمت دینی خواستم ۔" بابا صاحب نے فرمایا : وہ نعمتیں انہیں دی جاتی ہیں ۔ سلطان جی

---

[1] ۔ ایضاً ، ص ۲۶۳ ۔

[2] ۔ ایضاً ، ص ۲۸۲ ۔

فرماتے ہیں کہ عمر بھر ان کے دل میں یہ ملال رہا کہ اس وقت انہوں نے کیوں نہ اس بات کی التجا کی کہ ان کا انتقال سماع کے دوران ہو۔[1]

حضرت سلطان المشائخ کو پوربی کلام بہت پسند تھا۔ اس کے سننے سے رقت پیدا ہوتی ہے۔ حضرت امیر خسروؒ نے پوربی زبان میں کئی راگ مرتب کیے ہیں۔ شاید اس میں ان کے مرشد کی پسند کو دخل حاصل ہو۔

علمائے ظاہر بین کو سلطان المشائخ کے سماع سننے پر اعتراض تھا، حالانکہ وہ سماع کی ان تمام شرائط کا پاس کرتے تھے جن کا ذکر خود انہوں نے اپنے ملفوظات میں کیا ہے۔ جب سلطان غیاث الدین تغلق تخت نشین ہوا تو ظاہر بین علماء نے اسے حضرت نظام الدین اولیاء کے خلاف محضر طلب کرنے پر آمادہ کر لیا۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی، سیر الاولیاء کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ سلطان غیاث الدین تغلق نے یہ فیصلہ سلطان المشائخ سے کسی ذاتی مخاصمت یا مخالفت کی بنا پر نہیں کیا تھا بلکہ وہ اس مسئلہ کی صحیح نوعیت کو سمجھنا چاہتا تھا۔[2] سیر العارفین کے مصنف شیخ جمالی لکھتے ہیں کہ اس محضر میں ۲۵۳ علماء و اکابر شامل ہوئے۔[3] سلطان المشائخ کے حلقہ مریدین میں جید علماء شامل تھے لیکن انہوں نے کسی کو اپنی نصرت و اعانت کے لیے ساتھ لے جانا پسند نہیں کیا البتہ قاضی محی الدین کاشانی اور مولانا فخر الدین زرادی از خود محضر میں تشریف لے گئے۔[4] معترضین میں قاضی جلال الدین اور شیخ زادہ جام پیش پیش تھے۔ کئی بار وہ آپے سے باہر ہوگئے تو سلطان کو مداخلت کرنا پڑی۔ معترضین نے اپنے اعتراضات کی بنا امام اعظم ابو حنیفہؒ کے اقوال پر رکھی۔ سلطان المشائخ نے سماع کے جواز کے لیے بعض روایات

---

[1] علی بن محمود جاندار، درر نظامی، مخطوطہ سر سالار جنگ میوزیم حیدر آباد، ورق ۹۹ - الف -

[2] خلیق احمد نظامی، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، مطبوعہ دہلی ۱۹۵۸ء، ص ۳۱۵ -

[3] شیخ جمالی، سیر العارفین (اردو ترجمہ) مطبوعہ لاہور ۱۹۸۹ء، ص ۱۲۰ -

[4] خلیق احمد نظامی، کتاب مذکورہ، ص ۳۱۶ -

نبوی سے مدد لینی چاہی تو معترضین نے کہا کہ آپ تو امام اعظم کے مقلد ہیں اس لیے ان کے اقوال سے دلائل پیش کیجیے۔[۱] اس پر حضرت نے فرمایا کہ انھیں اس بات پر حیرت ہے کہ وہ شہر اب تک کیونکر آباد ہے جہاں کے باشندے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث پر کسی فقیہہ کے قول کو ترجیح دیتے ہوں ۔[۲] جب بحث نے زیادہ طول پکڑا تو سلطان غیاث الدین تغلق نے حضرت بہاء الدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ کے نواسے شیخ علم الدین سے استفسار کیا ۔ شیخ موصوف خود بڑے زبردست عالم تھے اور کئی اسلامی ممالک کا سفر کر چکے تھے ۔ انھوں نے سلطان کے استفسار پر فرمایا کہ جو لوگ دل سے سماع سنتے ہیں ، ان کے لیے مباح ہے اور جو از روئے نفس سنتے ہیں ، ان کے لیے حرام ہے ۔ انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ بغداد ، شام اور روم (ترکی) میں مشائخ سماع سنتے ہیں اور بعض تو دف اور شبانہ کے ساتھ بھی سنتے ہیں اور انھیں کوئی منع نہیں کرتا ۔[۳] اس محضر کی کارروائی پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ سلطان غیاث الدین تغلق نے شیخ علم الدین کی بات مان لی اور سلطان المشائخ کو سماع سننے کی اجازت دے دی لیکن قلندریوں اور حیدریوں جیسے ملامتی فقرا پر پابندی عائد کر دی ۔

حضرت بندہ نواز گیسو درازؒ فرماتے ہیں کہ ایک بار سلطان المشائخ نے فرمایا کہ ان کی یہ خواہش ہے کہ تین روز تک ان کی میّت کے پاس مجلس سماع منعقد کی جائے اور پھر انھیں دفن کیا جائے ۔ سلطان المشائخ نے یہ ذمہ داری مولانا شہاب الدین پر ڈالتے ہوئے فرمایا کہ وہ اس پر عمل کریں کیونکہ ہو سکتا ہے کہ ان کے خدّام اس وصیت پر عمل نہ کریں ۔

---

[۱] ۔ شیخ جمالی ، سیر العارفین ، ص ۱۲۰ ۔

[۲] ۔ سلطان المشائخ کے معتقدین کہتے ہیں کہ جب سلطان محمد بن تغلق نے دہلی کی بجائے دولت آباد کو اپنا دارالحکومت قرار دیا اور باشندگانِ دہلی کو زبردستی وہاں منتقل کیا تو دہلی اجڑ گئی ۔ تب لوگوں کو سلطان المشائخ کے اس قول کی سمجھ آئی ۔

[۳] ۔ شیخ محمد اکرام ، آب کوثر ، مطبوعہ لاہور ۱۹۵۲ء ، ص ۲۷۱ ۔

جب سلطان المشائخ کا انتقال ہوا تو شیخ ابوالفتح رکن الدین ملتانیؒ نے نماز جنازہ پڑھائی ۔ مولانا شہاب الدین حسب وصیت قوالوں کو لے کر آگے بڑھے اور انھوں نے شیخ ابوالفتح رکن الدینؒ کو سلطان المشائخ کی وصیت یاد دلائی ۔ حضرت نے فرمایا یہ درست ہے کہ یہ ان کی وصیت تھی لیکن اگر اس پر عمل کیا گیا تو سلطان المشائخ اٹھ کر رقص کرنے لگیں گے اور اس سے ایک بڑا فتنہ کھڑا ہو جائے گا ۔ اس لیے خدا کے لیے ان کی وصیت پر عمل نہ کیجیے ۔[1] حضرت گیسو درازؒ کے ملفوظات میں ایسے کئی واقعات کا ذکر آیا ہے جہاں سماع سن کر 'مردے زندہ ہوگئے تھے ۔ ایسی چیزیں موجودہ زمانے کے لوگوں کی سمجھ سے باہر ہیں ۔ میں یہاں شیخ محمد اکرام کا ایک قول نقل کرتا ہوں جو انہوں نے حضرت شرف الدین بو علی شاہ قلندرؒ کے حالات قلمبند کرتے ہوئے لکھا تھا ۔ شیخ صاحب فرماتے ہیں :

> "آپ کی زندگی کے کئی واقعات ہیں جنہیں اگر شرع ، وضع داری یا اخلاقیات کے ترازو میں تولیں تو اُن پر کئی اعتراض ہو سکتے ہیں لیکن دنیا آپ کو ایک قلندر کے طور پر جانتی ہے اور ظاہر ہے کہ جو شخص دنیا چھوڑ دیتا ہے اُسے دنیا داروں کے معیار سے نہیں جانچا جا سکتا ۔"[2]

میں اس باب کو طول نہیں دینا چاہتا ورنہ لکھنے کو بہت کچھ ہے ۔ مختصراً عرض ہے سلطان المشائخ کے جانشین حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ کو سماع سے دلچسپی نہ تھی ۔ ایک بار کسی نے ان سے کہا کہ ان کے مرشد تو سماع سنتے ہیں ، وہ کیوں نہیں سنتے ؟ انھوں نے فرمایا کہ مرشد کا فعل قابلِ حجت نہیں شارع علیہ السلام کا قول حجت ہے ۔ کسی حاسد نے حضرت نظام الدین اولیاء سے اس کا ذکر کیا تو انھوں نے فرمایا کہ مولانا محمود ٹھیک ہی تو کہتے ہیں ۔ ان کا اتقاء بہت بڑھا ہوا ہے"[3] ۔ ان کے جانشین حضرت بندہ نواز گیسو درازؒ فرماتے ہیں کہ ان کے مرشد حضرت چراغ دلّیؒ مزامیر پسند نہ کرتے تھے ۔

---

۱ - محمد اکبر حسینی ، جوامع الکلم . مطبوعہ کانپور ۳۵۶، ھ ، ص ۱۳۱ -

۲ - شیخ محمد اکرام ، آب کوثر ، ص ۲۸۷ -

۳ - ایضاً ، ص ۲۸۰ -

اگر کسی محفل میں مزامیر بجائے جاتے تو حضرت وہاں سے اٹھ جاتے تھے ۔ مزامیر کے بغیر وہ کبھی کبھار سماع سن لیتے تھے اور ان پر کیفیت طاری ہو جاتی تھی ۔ ایک بار بڑھاپے کے عالم میں ان پر ایسی کیفیت طاری ہوگئی کہ وہ اٹھ کر چکر لگانے لگے اورہاتھ پاؤں مارنے لگے ۔ حضرت گیسو درازؒ فرماتے ہیں کہ کوئی نوجوان بھی اپنی پوری توانائی کے ساتھ ایسا نہیں کر سکتا تھا ۔[1] ایک بار حضرت بندہ نواز گیسو دراز کے مکان پر محفل سماع منعقد ہوئی ۔ اتفاق سے اس وقت حضرت چراغ دلیؒ بھی وہاں موجود تھے ۔ جب قوال نے یہ شعر پڑھا :

سگے دنبال آں محمل او دواں من ہم
منش لبیک میگویم او سگ را ہمی خواند

تو حضرت چراغ دلی اس تیزی سے مجلس سے اٹھ کر بھاگے کہ حاضرین میں سے کوئی بھی ان کی گرد کو نہ پہنچ سکا ۔[2]

حضرت بندہ نواز گیسو دراز فرماتے ہیں کہ : چراغ دلیؒ ہندی راگ بہت کم سنتے تھے اور موصوف زیادہ تر فارسی کلام ہی پسند فرماتے تھے ۔ کئی بار یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ انھوں نے اپنی دستار اتار کر مطرب کو دے دی ۔ حضرت نظام الدین اولیاء کے انتقال کے بعد ایک روز ان کی خانقاہ میں مجلس سماع منعقد ہوئی تو جب قوال نے یہ مصرع پڑھا

مجلس یار یہاں است ولی یار کجا

تو حضرت چراغ دلیؒ نے اپنے سر سے طاقیہ اتار کر زمین پر پھینک دی ۔[3] حضرت چراغ دلیؒ سماع بالمزامیر کے اعلانیہ منکر تھے لیکن ان کے

---

۱ ۔ محمد اسلم ، سرمایۂ عمر ، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۶ء ، ص ۲۵۶ ۔
۲ ۔ ایضاً ۔
۳ ۔ محمد اکبر حسینی ، جوامع الکلم ، ص ۲۰۷ ۔

برادران طریقت میں سے حضرت برہان الدین غریب اور ان کے مرید مزامیر کے ساتھ سماع سنا کرتے تھے اور انھیں دف بہت پسند تھی ۔[1]

حضرت بندہ نواز گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے مرشد طریقت کے مزاج کے برعکس سماع کے ساتھ بڑی رغبت تھی ۔ ان کے مرید خاص اور ”سیر محمدی“ کے مصنف محمد علی سامانی نے ان کا یہ ملفوظ نقل کیا ہے :

فتح کار من بیشتر در
تلاوت و سماع بود۔[2]

میں نے سلوک کی منزل قرآن پاک
اور سماع سے طے کی ہے ۔

حضرت گیسو دراز فرمایا کرتے تھے کہ تان اور لے مرتب کرتے وقت اس بات کا خیال رکھنا چاہئیے کہ وہ غزل کے مضمون کے مطابق ہو ، مثلاً اگر اشعار میں بیزاری ، تضرع یا عجز و انکسار کا بیان ہو تو پھر لے بھی ویسی ہی ہونی چاہئیے اور اگر اشعار میں ترفع ، استغنا اور تعاظم کا ذکر ہو تو پھر لے بھی ویسی ہی ہونی چاہئیے ۔ اسی طرح جب کسی معشوق کے خد و خال یا ناز و کرشمہ کا ذکر آئے تو پھر سُر اور تال بھی اسی مناسبت سے ہونے چاہئیں ۔[3] حضرت فرماتے ہیں کہ ایک عورت حوض سلطان سے پانی کا گھڑا بھر کر لے جایا کرتی تھی ۔ صانع قدرت نے اسے بڑی اچھی شکل و صورت دی تھی ۔ جب وہ گھڑا سر پر دھر کر چلتی تو بڑا ناز و نخرا دکھاتی اور گانا بھی گاتی جاتی ۔ ایک درویش جو حوض سلطان کے کنارے رہتا تھا ، فن موسیقی کا بڑا ماہر تھا ۔ اس نے اس پوری کیفیت کو صوت و ساز میں باندھ کر حضرت گیسو دراز کو سنایا تو ان کی زبان سے بیساختہ سبحان اللہ نکلا ۔[4]

---

۱ - ایضاً - ص ۲۶۴ -

۲ - محمد علی سامانی ، سیر محمدی ، مطبوعہ الہ آباد ۱۳۴۷ھ ، ص ۷۱ -

۳ - محمد اکبر حسینی ، جوامع الکلم ، ص ۱۳۱ -

۴ - ایضاً -

حضرت گیسو دراز کے زمانۂ قیام دہلی میں ابراہیم نامی ایک سازندہ دہلی میں مقیم تھا۔ وہ چنگ بجانے کا ماہر تھا۔ ایک بار حضرت نے مولانا صدر الدین کے مطب پر اس سے چنگ سنی تو حضرت نے فرمایا کہ اگرچہ اس فن کے بڑے بڑے استاد موجود ہیں لیکن چنگ نوازی میں کوئی بھی ابراہیم کی گرد کو نہیں پہنچ سکتا۔ حملۂ تیمور کے بعد جب دکن جاتے ہوئے حضرت اپنے ملفوظات قلمبند کروا رہے تھے تو آپ نے سید محمد اکبر حسینی کی موجودگی میں حاضرین کو بتایا کہ انھوں نے اس کے بعد ایسی چنگ نہیں سنی۔[1]

حملۂ تیمور (۱۳۹۸ء) سے پہلے دہلی میں ایک اچھا قوال چھ جیتل سے زیادہ صلہ وصول نہ کرتا تھا۔ حسن ہیمندی، جو اپنے زمانے کا مشہور قوال تھا اور اس نے حضرت نظام الدین اولیاء اور حضرت نصیر الدین چراغ دلّی کا زمانہ پایا تھا، سولہ جیتل لے کر مجلسِ سماع میں شرکت پر آمادہ ہو جاتا تھا۔[2]

راقم نے اس مضمون میں سلطان شمس الدین التمش (م ۱۲۳۶) سے لے کر حملۂ تیمور (۱۳۹۸ء) تک خانقہوں میں منعقد ہونے والی مجالسِ سماع کا احاطہ کیا ہے۔ شاہی درباروں اور طوطئ ہند حضرت امیر خسرو علیہ الرحمہ کے لیے الگ الگ ابواب درکار ہیں۔

ء

پھر بہار لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن
پھر مجھے نغموں پہ اکسانے لگا مرغِ چمن

(اقبال)

---

[1] ۱ - ایضاً - ص ۱۷۸ -

[2] ۲ - ایضاً - ص ۸۷ -

حضرت امیر خسروؒ اور فنِ موسیقی

ابو الحسن یمین الدین المتخلص بہ خسرو و المدعو بہ حضرت امیر خسرو، جنھیں ہندوستانی موسیقی کا امام تسلیم کیا گیا ہے ، ١٢٥٣ء میں موجودہ اُتر پردیش کے ضلع ایٹہ کے مشہور قصبے پٹیالی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد محترم امیر سیف الدین محمود کا تعلق ترکوں کے لاچین قبیلے سے تھا اور وہ تلاش معاش کے سلسلے میں ترکستان سے برعظیم پاک و ہند آئے۔ ان کی والدہ ماجدہ ایک نو مسلم رئیس کی بیٹی تھیں۔ امیر خسرو میں شاعری کا جذبہ فطری تھا۔ وہ ایک موقع پر لکھتے ہیں کہ ابھی ان کے دودھ کے دانت بھی نہیں گرے تھے کہ وہ شعر کہنے لگے۔

امیر خسرو نے پندرہ برس کی عمر میں تمام درسی علوم و فنون سے فراغت حاصل کر لی۔ انھیں عربی ، فارسی اور ہندی پر کامل دسترس تھی۔ ہندی پر عبور نے ان کے لیے ہندوستانی موسیقی تک رسائی آسان بنا دی۔ تحصیل علم سے فارغ ہوتے ہی وہ بلبن کے ایک درباری ملک چھجو کی سرکار میں ملازم ہوگئے۔ کچھ عرصے بعد ان کا تعارف بلبن کے فرزند بغرا خان سے ہوا تو وہ انھیں اپنے ساتھ بنگال لے گیا۔ کچھ عرصہ بنگال میں قیام کے بعد موصوف دہلی چلے آئے اور بلبن کے بڑے بیٹے شہزادہ محمد کے ملازموں میں داخل ہوگئے۔ امیر خسرو شہزادہ محمد کے ساتھ پانچ سال ملتان میں رہے۔ ١٢٥٨ء میں شہزادہ منگولوں کا مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہوا اور امیر خسرو گرفتار ہوئے۔ انھوں نے پتہ نہیں کس طرح آزادی حاصل کی۔ آزاد ہوتے ہی امیر خسرو پٹیالی پہنچے اور اپنی والدہ کے دیدار سے مشرف ہوئے۔ اس کے بعد ان کا تعلق براہ راست شاہی دربار سے قائم ہو گیا اور انھوں نے کیقباد سے لے کر سلطان محمد بن تغلق تک کا زمانہ دیکھا۔ اس دوران میں انھوں نے بیس کتابیں تصنیف کیں۔

حضرت امیر خسروؒ کو سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء سے والہانہ عقیدت تھی اور سلطان جی بھی انھیں بڑا عزیز رکھتے تھے۔ امیر خسرو نے ان کی

شان میں کئی منقبتیں لکھی ہیں اور ان میں سے بعض کو موسیقی کا جامہ بھی پہنایا ہے ۔

حضرت امیر خسرو کی والدہ ماجدہ ہندوستانی تھیں اس لیے انھیں ہندوستان کی ہر شے کے ساتھ پیار تھا ۔ ان کے کلام میں بھی مقامی رنگ کا عنصر موجود ہے ۔ حضرت امیر خسرو نے جب ہندوستانی موسیقی کی طرف توجہ دی تو اسے بام عروج تک پہنچا دیا ۔ فقیر اللہ سیف خان اور ڈاکٹر وحید مرزا نے مندرجہ ذیل راگوں کی ایجاد کا سہرا امیر خسرو کے سر باندھا ہے :

مجیر ، ساز گاری ، زمزمہ ساز گری ، ایمن ، عُشاق ، موافق ، غنم ، زیلف ، فرغنہ ، سرا پردہ ، باخرز ، فرودست ، قول ، ترانہ ، خیال ، نگار ، بسیط ، شاہانہ اور سہیلا[1] ۔

ڈاکٹر سید رغیب حسین لکھتے ہیں کہ امیر خسرو ایک با کمال ماہر موسیقی تھے ۔ ایسے با کمال انسان کی نظیر دنیا میں مشکل سے ملتی ہے ۔ سیکڑوں سال کے بعد کہیں ایک دو ایسی ہستیاں پیدا ہوتی ہیں ۔ ان کی موزونیٔ طبع کا یہ حال تھا کہ جس آواز کو چاہیں نظم کر دیتے تھے ۔ مثلاً دہل کی آواز کی انھوں نے کتنی عمدہ نقل کی ہے :

دہل زن دہل زد بہ تحسین او
کہ دہن ، دہنِ او ، دہنِ او ، دہنِ او

ایک بار انھوں نے نصف شب کے وقت نوبت کی آواز سنی تو انھوں نے اسے ان الفاظ میں ادا کیا :

نان کہ خوردی خانہ برو ، نان کہ خوردی خانہ برو ، خانہ برو ، خانہ برو
نان کہ خوردی خانہ برو ، نہ کہ بدست تو کردم خانہ گرو ، خانہ برو ، خانہ برو[2] ۔

---

۱ ۔ ڈاکٹر سید رغیب حسین ، ماہنامہ آجکل دہلی ، موسیقی نمبر ماہ اگست ۱۹۵۶ء ، ص ۵۷ ۔ ۵۶ ۔

۲ ۔ ایضاً ، ص ۵۶ ۔

ایک بار انھوں نے دھنیے کو روئی دھنتے ہوئے دیکھا تو اس کی آواز حضرت امیر خسرو نے ان الفاظ میں محفوظ کر لی :

درپئے جاناں ہم رفت ، جاں ہم رفت ، جاں ہم رفت ، رفت رفت ،
جاں ہم رفت اینہم رفت و آنہم رفت ، آنہم رفت ، آنہم رفت ،
اینہم آنہم ، اینہم آنہم آنہم رفت ، رفتن ، رفتن ، رفتن دہ ، ِدہ ،
ِدہ رفتن ِدہ ، رف رف ، رفتن دہ رفتن دہ ۔

اللہ اللہ ۔ کس قدر حاضر دماغ ہے کہ بے تکلف جچے تلے حرفوں سے مختلف آلات کی صدا پیدا کر دی ہے ۔ جو سنتا ہے ایک دفعہ تو محو حیرت ہو جاتا ہے اور ممکن نہیں کہ عمر بھر بھول جائے یا ذہن سے محو ہو جائے ۔ یہ کمال صرف اور صرف فن موسیقی میں استادانہ مہارت کی بدولت تھا[1] راقم کی رائے میں حضرت امیر خسرو کی صدا بندی موجودہ دور کی نوٹیشن سے کسی طرح کم نہیں ہے ۔

حضرت امیر خسرو نے چند ساز بھی ایجاد کیے ہیں ۔ ایک روایت کے مطابق انھوں نے پکھاوج کو کاٹ کر اس کے دو طبلے بنا دیے اور ان کی یہ ایجاد اس قدر مقبول ہوئی کہ اب قوالی یا موسیقی کا لطف طبلے کے بغیر تصور میں نہیں آ سکتا ۔

ماہرینِ موسیقی کی یہ رائے ہے کہ ستار بھی ان کی ایجاد ہے ۔ پہلے ہمارے ہاں اکتارہ مروج تھا ۔ امیر خسرو نے اس میں دو تاروں کا اضافہ کر کے اسے "سہ تار" بنا دیا ۔ راقم کے دادا استاد پروفیسر حسن عسکری (عظیم آبادی) کا خیال ہے کہ ستار دراصل 'سر تار کی بدلی ہوئی شکل ہے[2] ۔ بہرحال موسیقاروں کا یہ کہنا ہے کہ انھوں نے ستار کو موجودہ شکل دے کر ہندوستانی موسیقی کی ایک بڑی کمی پوری کر دی ۔ امیر خسرو نے اپنی تصانیف میں جنگ ،

---

[1] ۔ ایضاً ۔

[2] ۔ سید حسن عسکری ، امیر خسرو احوال و آثار ، دہلی : ۱۹۷۵ء ، ص ۳۷۱ ۔

دف ، رباب ، نال ، طنبور ، بربط ، رود ، عود ، طبل ، تاسہ ، نفیر ، دہل ، کرنا اور شہنائی کا ذکر کیا ہے ۔ ان میں کئی ساز عرب اور ایران میں استعمال ہوتے تھے ۔ انھوں نے ان سازوں کی ہیئت بیان کرنے کے علاوہ انہیں بجانے کے طریقے بھی بتائے ہیں اور اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ مختلف اقسام کے ساز بلا تکلف بجا لیتے تھے ۔

آفتابِ موسیقی استاد چاند خان مرحوم نے "موسیقیٔ حضرت امیر خسرو" کے عنوان سے ایک ضخیم کتاب تحریر کی ہے جو ۱۹۷۸ء میں دہلی سے طبع ہو چکی ہے ۔ استاد چاند خان نے ان کے راگوں کی نوٹیشن دے کر اسے عام گانے والوں کے لیے آسان بنا دیا ہے ۔ امیر خسرو نے زیادہ تر حضرت نظام الدین اولیاء کی منقبتیں راگوں کی شکل میں پیش کی ہیں ۔ ان کے بعض راگوں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بھی ذکر آیا ہے ۔ ایک حدیث میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ ارشاد ہوا ہے :

من کنت مولا فعلی مولا ۔

حضرت امیر خسرو نے اسے قول راگ صنم عنم میں یوں ادا کیا ہے :

آروہی : سارے گاما دہانی دھارا

امروہی : سانی دھاپا ما پا گام گارے سا

اس کی استائی یوں ہوگی ۔

من کنت مولا فعلی مولا
دار تیلے دارا تیلے در دانی

اور اس کا انترہ یہ ہوگا :

ہم توم تنا نا نا نا نا نا نا رے
یالی یا لالی لایا لالی
یلا لا لا یلا لا لا یلا لا لارے[1]

استاد چاند خان لکھتے ہیں کہ قول راگ صنم غنم دو راگوں سے مرکب

---

[1] ۱ ۔ چاند خان ، موسیقیٔ حضرت امیر خسرو ، ص ۲۶۱ ۔

133534

ہے۔ اس میں حضرت امیر خسرو نے صنم اور غنم کو جمع کر دیا ہے۔ اس کی آروہی میں ایمن کے سُر اور امروہی میں بلاول کے سُر لگتے ہیں۔ یہ راگ رات اور دن کے دو راگوں کو ملا کر بنایا گیا ہے۔ اس لیے یہ دن اور رات کے کسی بھی حصے میں گایا جا سکتا ہے۔ یہ راگ عام طور پر صوفیاء کرام کی خانقاہوں میں محفلِ سماع کے آغاز میں پیش کیا جاتا ہے۔

حضرت امیر خسرو نے اپنے ایک سوہلہ یمن راگ میں اپنے مرشد حضرت نظام الدین اولیاء کا ذکر اس طرح کیا ہے:

آروہی : سارے گاما پا دھا نی سا

امروہی : سا نی دھا پا ما گام گارے سا

آستائی : چھاپ تلک سب چھینی مو سے نینا ملا کے
اپنی سی کر لینی مو سے نینا ملا کے

انترا نمبر ۱ : پریم بھٹی کا مدھوا پلا کے
متوالی کر لینی مو سے نینا ملا کے

انترا نمبر ۲ : بل بل جاؤں تورے رنگ رجوا
اپنی سی رنگ لینی مو سے نینا ملا کے

انترا نمبر ۳: خسرو نجام کے بل بل جائیے
موہے سہاگن کینی مو سے نینا ملا کے

حضرت امیر خسرو نے سگھرئی اور بہار کو ملا کر سویلہ سگھری بہار تیار کیا ہے۔ راگ بہار صرف بہار کے موسم میں ہی گایا جاتا تھا۔ جناب امیر نے اسے غیر موسمی راگ سگھری میں ملا دیا ہے تا کہ یہ ہر موسم میں گایا جا سکے۔ اس کی آروہی یوں ہوگی:

سارے گ رے گ م پاں دہاں پا دہا نی سا

اور امروہی یوں ادا کی جائے گی:

سا نی سا دہاں پام پا گ م رے پا گ م رے سا

اس کی آستائی یوں ہے :

بہت کٹھن ہے ڈگر پن گھٹ کی
کیسے میں بھر لاؤں مدھوا سے مٹکی

اور انترا نمبر ۱ یوں ہوگا :

پنیاں بھرن کو میں جو گئی تھی
دوڑ جھپٹ موری مٹکی رے ٹپکی
بہت کٹھن ہے ڈگر پنگھٹ کی

اس کا انترا نمبر ۲ یوں پیش کیا جائے گا :

خسرو نظام کے بل بل جایئے
لاج رکھو مورے گھونگھٹ پٹ کی
بہت کٹھن ہے ڈگر پنگھٹ کی

حضرت امیر خسرو نے منڈھا گیت بطرز تلنگ پیش دیا ہے۔ یہ عام طور پر نکاح کے بعد بیٹی کو گھر سے رخصت کرنے وقت گایا جاتا ہے۔ اس کی یہ تاثیر بیان کی جاتی ہے کہ اسے سن کر بڑے بڑے سنگدل انسانوں کے دل موم کی طرح پگھل جاتے ہیں اور سامعین کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑیاں لگ جاتی ہیں۔

اس کی آروہی یوں ہے :

سا گا م پا دھا پا دھا نی سا

منڈھا گیت بطرز تلنگ کی امروہی یہ ہوگی :

سا نی سا نی دھا پا گا م گا رے سا

اس کی آستائی یہ ہے :

کاہے کو بیاہی بدیس رے لکھی بابل مورے

اور اس کے دس انترے یوں ہوں گے :

بھائیوں کو دینو محل دو محلے
ہم کو دیا پردیس رے لکھی بابل مورے
ہم تو بابل تیرے بیلے کی کلیاں
گھر گھر مانگی جائیں رے لکھی بابل مورے
ہم تیرے انگنا کی بھولی رے چڑیاں
چگیں پئیں اڑ جائیں رے لکھی بابل مورے
ہم تیرے کوچہ کی بھولی رے گیّاں
ہانکے جدھر ہنک جائیں رے لکھی بابل مورے
طاق بھری میں نے گڑیاں جو چھوڑیں
چھوٹا سہیلیوں کا ساتھ رے لکھی بابل مورے
سونا بھی دینو روپا بھی دینو
دینو رتن جڑاؤ رے لکھی بابل مورے
ایک نہ دیو مورے سر کی کنگھی
ساس نند طعنے ماریں رے لکھی بابل مورے
ننگے پاؤں مورا بابل جو دوڑا
سمدھی ڈولا تھام رے لکھی بابل مورے
ڈولی کا پردہ اٹھا کر جو دیکھا
آیا پرایا دیس رے لکھی بابل مورے
امیر خسرو یوں کہیں تیرا
دھن دھن بھاگ سہاگ رے لکھی بابل مورے

سویلہ کھاج رات کے وقت گایا جاتا ہے ۔ حضرت امیر خسرو نے اپنے مرشد سلطان المشائخ کی منقبت اس راگ میں اس طرح پیش کی ہے :

آروہی : سارے سا گام پا دہا نی سا
امروہی : سا نی ساں دہا پا گام گا رے سا

اس کی آستائی یوں ہوگی :

میں نظام سے نینا لگا آئی رے
گھر ناری اناڑی چاہے جو کہے
میں نظام سے نینا لگا آئی رے

انترا نمبر ۱ : سانوری صورت موہنی مورت ہردے بیچ سما لائی رے
میں نظام سے نینا لگا آئی رے

انترا نمبر ۲ : ساس نندیا لگیں تو کہوں گی میں تو ان پہ جوبن گنوا آئی رے
میں نظام سے نینا لگا آئی رے

انترا نمبر ۳ : خسرو نظام کے بل بل جایئے
میں تو انمول چیری بکا آئی رے
میں نظام سے نینا لگا آئی رے

راقم کو یاد آیا کہ ابوالاثر حفیظ جالندھری دوسری عالمی جنگ کے زمانے میں اس محکمے سے وابستہ تھے جو خصوصی پروپاگنڈہ کے لیے بنایا گیا تھا ۔ انھوں نے لوگوں کو فوج میں بھرتی ہونے کے لیے سویلہ کھاج میں ایک گیت لکھا تھا جس کا ایک بول مجھے یاد ہے :

میں تو چھورے کو بھرتی کرا آئی رے
اڑوسن پڑوسن چاہے جو کہے
میں تو چھورے کو بھرتی کرا آئی رے

جب میں نے حضرت امیر خسرو کے سویلہ کھاج میں یہ بول پڑھا :

میں نظام سے نینا لگا آئی رے

تو میرا خیال فوراً حفیظ جالندھری کے اس گیت کی طرف گیا جس میں مرحوم نے حضرت امیر خسرو کا تتبع کیا ہے ۔

حضرت امیر خسرو کے کلام میں ایسی بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتیں ہیں لیکن یہاں صرف چند مثالوں پر ہی اکتفا کرتا ہوں ۔ انھوں نے ایرانی اور

ہندوستانی موسیقی کو ملانے کی کوشش کی اور ہندوستان کی قدیم موسیقی کو انھوں نے نہ صرف یہ کہ محفوظ کیا بلکہ اس میں بڑا عمدہ اضافہ کیا ہے ۔

حضرت امیر خسرو ۱۰ نومبر ۱۳۲۴ء کو فوت ہوئے اور اپنے مرشد کے پائیں جانب دفن ہوئے ۔ حضرت نظام‌الدین اولیاء کے مزار پر حاضری دینے والے زائرین پہلے ان کے مزار پر حاضری دیتے ہیں اور پھر سلطان جی کی بارگاہ میں حاضر ہوتے ہیں ۔ ان کی زندگی میں بھی یہی معمول تھا کہ عقیدت مند حضرت امیر خسرو کی وساطت سے ہی سلطان جی کی خدمت میں بار یاب ہوا کرتے تھے ۔

فضا یہ نغموں سے بھر گئی ہے کہ موج دریا ٹھہر گئی ہے
سکوت نغمہ بنا ہوا ہے وہ جیسے کچھ گنگنا رہے ہیں
(جگر)

سلطان فیروز تغلق
کا
ذوقِ موسیقی

سلطان فیروز تغلق کے بارے میں اس کے ہم عصر مؤرخ شمس سراج عفیف نے حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیاؒ کے جلیل القدر خلیفہ حضرت شیخ قطب الدین منورؒ کا یہ قول نقل کیا ہے[1] ۔

> سلطانِ فیروز شیخی است از مشائخ طریقت کہ تاج شاہی برسر دارد ۔

> ترجمہ : سلطان فیروز مشائخ طریقت میں سے ایک شیخ ہے جو تاجِ شاہی سر پر رکھے ہوئے ہے ۔

شیخِ موصوف کے اس قول میں بھلا کیا کلام ہو سکتا ہے ؟ سلطان فیروز تغلق واقعی بڑی خوبیوں کا مالک تھا اور قرونِ وسطیٰ میں جب چاروں طرف جبر و استبداد کا دور دورہ تھا تو برعظیم میں اس فرشتہ خصلت سلطان کا وجود غنیمت تھا ۔ یہ سلطان کی تصویر کا صرف ایک رخ ہے جو اس کے ہم عصر صوفیوں اور درویشوں نے ہمیں دکھلایا ہے ۔ اس کی تصویر کا ایک اور بھی رخ ہے جس کی ایک رنگیں جھلک تاریخ فیروز شاہی میں دکھائی دیتی ہے ۔ جب ہم اس کتاب کا مطالعہ شروع کرتے ہیں تو ہمیں سلطان فیروز تغلق ایک ولی اللہ کے روپ میں نظر آتا ہے ۔ شمس سراج عفیف نے اسے ایک ولیٔ کامل ، علم لدنی کا حامل ، دنیا کا سب سے بڑا منصف ، حامیٔ شریعت اور ماحیٔ بدعت بتایا ہے سلطان فیروز تغلق کے مناقب اور محامد پڑھتے پڑھتے جونہی

---

[1] ۱ - شمس سراج عفیف، تاریخ فیروز شاہی، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۹۰ء، ص۲۲-۲۳-

ایک قاری تین سو چھیاسٹھواں صفحہ الٹتا ہے تو اس کی نظریں اس عبارت پر جم جاتی ہیں :

بعد از نماز جمعہ حضرت شاہ می فرمود کہ طائفہ مطربان ہر چہار شہر و طائفہ پہلوانان ایں ہر چہار مقام و طائفہ ادوتیان را ہر روز جمعہ بعد ادائے نماز درون در سرائے حاضر آرند ۔ چون حضرت شاہ فیروز از نماز جمعہ باز گشتے در محل چھجۂ چوبین بار دادے ایں ہر سہ طائفہ موازنۂ دو سہ ہزار آدمی را جمع میکردند ایشان را بحضرت سلطان فیروز شاہی میبردند ۔ حضرت سلطان یک زمان باطائفہ مطربان و شنیدن سرودِ ایشان مشغول می گشت[1] ۔

> ترجمہ : بادشاہ کے فرمان کے مطابق چاروں شہروں کے مطربوں کی منڈلیاں پہلوانوں کی ٹولیاں اور داستان گو نماز جمعہ کے بعد شاہی محل میں حاضر ہوتے ، جب بادشاہ نماز جمعہ سے فارغ ہوکر چوبین محل میں تشریف لاتا تو یہ تینوں گروہ ، جن کی تعداد دو تین ہزار تک ہوتی تھی ۔ بادشاہ کے حضور میں پیش کیے جاتے ۔ بادشاہ کچھ دیر تک مطربوں سے گانا سننے میں مگن رہتا ۔

سلطان کی موسیقی میں دلچسپی کی وجہ سے برصغیر میں اس فن کو بڑا فروغ ہوا اور دہلی موسیقی کا گہوارہ سمجھا جانے لگا ۔ موسیقار اور سازندے دور دراز کے شہروں سے نقل مکانی کر کے دہلی میں آباد ہونے لگے ۔ شمس سراج عفیف کا یہ بیان خاص توجہ کا مستحق ہے ۔

کاروبار مطربانِ دہلی بجائے رسید کہ فرزندانِ خورد سال برابر خود کردہ از شہر دہلی در شہر فیروز آباد می آمدند ۔ بلکہ ہرا کرا پسری چہار سالہ بودی برابر خود کردہ در فیروز آباد می آوردند[2] ۔

> ترجمہ : دہلی کے مطربوں کے کاروبار کی یہاں تک نوبت پہنچی کہ وہ دہلی سے اپنے صغر سن بچوں کو ساتھ لے کر فیروز آباد آنے لگے

---

١ - شمس سراج عفیف ، تاریخ فیروز شاہی مطبوعہ کلکتہ ١٨٩٠ء ، ص ٣٦٧ ۔

٢ - شمس سراج عفیف ، تاریخ فیروز شاہی مطبوعہ کلکتہ ١٨٩٠ء ، ص ٣٦٨ ۔

> یہاں تک کہ بعض لوگ اپنے چار یا پانچ سال کے بچوں کو ساتھ لے کر فیروز آباد چلے آئے تھے ۔

تاریخ فیروز شاہی میں شمس سراج عفیف ایک جگہ جشنِ عید کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے ۔

طائفہ مطربان و اہل طرب را میبردند تمام مطربان جامہ ہائے معصفر در بر و دستارہائے لعل برسر و طائفہ اہلِ طرب با پیرا یہای مرصع و مکلل و لباس ہائے بیش بہا ہر یک نفر چہل گان ہزار تنکہ را دیرایہ پوشیدہ ہر یکی ناد وشیدہ القصہ چوں این چنین مرتب گشت طائفہ قوال ساز برگرفتند اہل طرب برقص مشغول شدند[1] ۔

> ترجمہ : مطربوں اور ناچنے والوں کو طلب کیا جاتا ۔ تمام مطرب زعفرانی لباس میں ملبوس ہوتے اور ان کی دستاروں پر لعل ٹکے ہوئے ہوتے ۔ ناچنے والوں کے لباس مرصع و مکلل ہوتے ۔ یہ لباس بڑا قیمتی ہوتا تھا ۔ چنانچہ ایک شخص کے لباس کی قیمت چالیس ہزار تنکہ ہوا کرتی تھی اور یہ لباس بالکل نیا ہوا کرتا تھا ۔ جب اس طرح کا سماں بندھ جاتا تو قوال ساز اٹھا لیتے اور اہل طرب رقص میں مشغول ہو جاتے ۔

فاضل مؤرخ کے ان بیانات سے سلطان فیروز تغلق کے ذوق موسیقی کا پتہ چلتا ہے اور ہم اس پر حاشیہ آرائی کی ضرورت محسوس نہیں کرتے ۔

ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ رقمطراز ہیں کہ محمد تغلق کا جانشین فیروز شاہ تغلق اگرچہ زاہد خشک تھا مگر موسیقی کا شوق رکھتا تھا ۔ چنانچہ جب اس کی تاجپوشی ہوئی تو اس موقع پر موسیقی کی ایک محفل قائم ہوئی جو اکیس روز تک جاری رہی اور اس میں ارکانِ سلطنت اور اہلِ دربار نے شرکت کی ۔[2]

---

[1] ۔ ایضاً ، ص ۳۶۳ ۔

[2] ۔ ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ ، "سلاطین اسلام اور موسیقی" مشمولہ ماہنامہ نیرنگ خیال موسیقی نمبر ، بابت نومبر ۱۹۶۰ء ، ص ۱۰۲ ۔

یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ سلطان فیروز تغلق کے عہد میں جہاں علم فقہ پر فوائد فیروز شاہی ، فتاوی تتار خانیہ اور فقہ فیروز شاہی جیسی بلند پایہ کتابیں لکھی گئیں وہاں فن موسیقی پر بھی غنیۃ المنیہ ، کنزالتحف اور فرید الزمان فی معرفت الالحان جیسی قابل قدر کتابیں احاطہ تحریر میں آئیں۔

غنیۃ المنیہ

سلطان فیروز تغلق کے عہد میں شمس الدین ابراہیم گجرات کا گورنر تھا اور وہ موسیقی کی سرپرستی میں سلطان سے بھی بازی لے گیا تھا ۔ اس نے اپنے دربار میں اس عہد کے بہترین موسیقار اور سازندے جمع کر لیے تھے ۔ اس کے بارے میں یہ معلوم ہوا ہے کہ جب وہ دن بھر کے کام کاج سے تھک جاتا تو سکون حاصل کرنے کے لیے فارسی اور ہندی نغمات سے جی بہلایا کرتا تھا۔ اتفاق سے اس کے مصاحب فن موسیقی سے نابلد محض تھے ۔ اس لیے ان میں اس فن لطیف کا شعور پیدا کرنے کی خاطر اس نے کسی ماہر موسیقار سے غنیۃ المنیہ کے نام سے ایک کتاب مرتب کروائی[1] ۔ کتاب کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے ۔

> ”داری ہفت کشور انوشروان عہد و زمان اسکندر مکنت و جمشید امکان الواثق بتائید الرحمٰن ابو المظفر فیروز شاہ السلطان خلد اللہ ملکہ و سلطانہ . . .“[2] ۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ کے سابق سربراہ جناب ڈاکٹر نور الحسن صاحب کی اہلیہ مرحومہ خورشید لقا بیگم فرمانروائے رام پور کی صاحبزادی تھیں اور انھوں نے موسیقی کا ذوق ورثے میں پایا تھا ۔ دربار

---

[1] ۔ خورشید لقا بیگم ، دی ارلی اسٹ پرشین مینو سکرپٹ آن انڈین میوزک ، مخطوطہ شعبہ تاریخ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ، ص ۱ ۔

[2] ۔ غنیۃ المنیہ ، مرتبہ خورشید لقا بیگم ۔ مخطوطہ شعبہ تاریخ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ، ص ۱ ۔
اس کتاب کا ایک نسخہ انجمن ترقی اردو کراچی کے کتب خانہ میں بھی موجود ہے ۔
سرفراز علی ، مخطوطات انجمن ترقی اردو (فارسی و عربی) شمارہ ۵۳۳۔

رام پور کسی زمانے میں موسیقی کا گہوارہ سمجھا جاتا تھا اور برعظیم کے نامی گرامی گوئیے سرکار رام پور میں ملازم تھے - مرحومہ بیگم صاحبہ نے اسی ماحول میں آنکھیں کھو لیں اور اپنے والد بزرگوار سے موسیقی کے اسرار و رموز سیکھے - اس فن پر مرحومہ کی بڑی گہری نظر تھی - چنانچہ انہوں نے انڈیا آفس لائبریری لندن سے غنیة المنیہ کی نقل منگوائی اور اسے بڑی دیدہ ریزی اور کاوش سے مرتب کیا ان کا مرتب کردہ کتاب کا مسودہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ کی لائبریری میں موجود ہے - اس کتاب کا متن فل سکیپ سائز کے ۱۱۷ صفحات پر پھیلا ہوا ہے - اسی سے اس کتاب کی ضخامت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے - فارسی متن درست کرنے کے علاوہ مرحومہ نے اس کا انگریزی میں ترجمہ بھی کیا ہے جو اپنی جگہ خود ایک اہم کام ہے -

یہ کتاب ۷۷۶ھ/م - ۱۳۷۳ء میں احاطۂ تحریر میں آئی - مصنف کا نام متن میں کسی جگہ بھی نہیں آیا - اس سے ایک قاری یہ تاثر لے سکتا ہے کہ یہ کتاب کہیں شمس الدین ابراہیم ہی کی تصنیف نہ ہو کیونکہ جب اس کے علاوہ اور کوئی شخص صاحبِ ذوق و فہم گجرات میں موجود نہ تھا تو پھر اسی نے ہی اپنے مصاحبوں میں موسیقی کا ذوق پیدا کرنے کی خاطر یہ کتاب قلمبند کی ہوگی - لیکن کتاب کے دیباچہ میں جن القاب کے ساتھ شمس الدین ابراہیم کا ذکر خیر آیا ہے ان سے یہ تاثر فوراً زائل ہو جاتا ہے کہ یہ کتاب اسی کی تصنیف ہے - مصنف نے اپنے ممدوح کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے :

> ذات معظم و عوض مکرم و ملک زادہ ستودہ شیم مہر سپہر سروری شمع دودمان مہتری معدن گوہر فضل و فصاحت و گوہر معدن عقل و کیاست افضل العہد و العصر منشی النظم و النثر جامع الفضائل و الکمالات و صاحب الرای و الکفایات ذوالمکارم والاخلاق المشہور فی الافاق سپہبد اردمان و سپہبد کیہان ملک الامراء ملاذالکبرأ شمس الدولة والدین ابراہیم حسن ابورجا احسن اللہ الیہ فی الدرین والدنیا . . . ۱"۔

---

۱ - غنیة المنیہ ، مرتبہ خورشید لقا بیگم ، مخطوطہ شعبۂ تاریخ علی گڑھ یونیورسٹی ، ص ۱۱ -

شمس الدین ابراہیم ۷۷۶ھ/۴ - ۱۳۷۳ء میں گجرات کا گورنر مقرر ہوا تھا۔ وہ بڑا پڑھا لکھا شخص تھا اور اس کے گجرات پہنچتے ہی وہاں نغمہ و سرود کی محفلیں منعقد ہونے لگیں اور اس دیار میں اس فن کو خوب فروغ ہوا۔ فاضل مصنف نے اس بات کا ذکر بڑے ہی دلکش اور حسین پیرایہ میں کیا ہے:

> از جنبش طبع آن شاہ سریر بلاغت پردۂ عروسِ موسیقی تار تار شدہ[1]۔

فاضل مصنف کا کہنا ہے کہ اس نے یہ کتاب بڑھاپے کے عالم میں لکھی ہے۔ اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ وہ کہنہ مشق موسیقار تھا اور اسے فن پر پوری طرح دسترس تھی۔ ہمارے اس خیال کی تائید غنیۃ المنیہ کے مطالعہ سے بھی ہوتی ہے۔ اس کتاب میں فاضل مصنف نے جن فنی اصطلاحات کا ذکر کیا ہے وہ ایک عام قاری اور مبتدی موسیقار کی سمجھ سے بالاتر ہے۔

غنیۃ المنیہ دو اقسام، چار ابواب اور اٹھارہ فصلوں پر مشتمل ہے۔ کتاب کا بیشتر حصہ ایسی فنی اصطلاحات پر مشتمل ہے جن تک اس خاکسار کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ البتہ آداب سماع کے متعلق جو باتیں فاضل مصنف نے عام فہم زبان میں تحریر کی ہیں وہ پیش خدمت ہیں۔

فاضل مصنف لکھتے ہیں کہ محفل سماع ایک وسیع اور مسقف جگہ منعقد کرنی چاہیے۔ تہ نشین پر نمدے یا کمبل بچھا کر ان پر کافور اور گلاب چھڑکنا چاہیے۔ عوام کے بیٹھنے کے لیے فرش پر درختوں کے سبز پتے بچھانے چاہئیں۔ صدر مجلس اس بات کا اہتمام کرے کہ اس کا رخ شمال یا مشرق کی طرف ہو اور قوال اس کے سامنے بیٹھیں۔ اسے چاہیے کہ وہ زاہدوں اور عابدوں کو اپنی دائیں طرف جگہ دے اور موسیقی دانوں اور اہلِ علم کو بائیں جانب بٹھائے۔ فاضل مصنف کے خیال میں صدرِ مجلس کے لیے سخی، خوش مزاج اور خوش پوشاک ہونا ضروری ہے۔ صدر کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ سماع کے دوران کسی پر اعتراض نہ کرے اور نہ ہی کسی قسم کے فتنہ و فساد کو ہوا دے۔ اسی طرح حاضرین مجلس پر یہ لازم ہے کہ وہ کسی بات پر غصہ نہ کریں اور دورانِ سماع قوالوں اور گویوں کا پاس ادب کریں۔ علاوہ ازیں حاضرین مجلس کو چاہیے کہ وہ صدر مجلس کی عزت کا بھی خیال رکھیں اور اس کی تعریف

---

[1] ۱ - ایضاً، ص ۲ -

کریں ۔ اگر کوئی شخص ان قیود کی پابندی نہیں کر سکتا تو اس کے لیے یہی بہتر ہے کہ وہ محفلِ سماع میں شریک نہ ہو[1] ۔

صاحب غنیۃ المنیہ نے مختلف اقسام کے راگ گانے کے طریقے بڑی وضاحت کے ساتھ تحریر کیے ہیں ۔ اسی طرح اس نے مختلف اقسام کے سازوں کا بھی بڑی تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے ۔ اس نے ایک ایک ساز کا سائز اور اس کی شکل و ہیئت اپنی کتاب میں درج کی ہے ۔ مثلاً یہی ایک مثال لے لیجیے کہ پکھاوج کے متعلق فاضل مصنف لکھتا ہے کہ اس کی لمبائی ۳۱ انگشت اور اس کے دہن کا قطر ۱۳ انگشت ہونا چاہیے[2] ۔ اسی کتاب میں مصنف نے آلاتِ موسیقی بنانے والوں کو ہدایات دی ہیں کہ کونسا ساز کس قسم کی لکڑی سے بنانا چاہیے ۔ ایک ماہر موسیقار کی طرح فاضل مصنف کو اس بات کا احساس ہے کہ اگر مختلف سازوں میں اس کی من پسند لکڑی استعمال نہ کی گئی تو ایسے سازوں سے اعلیٰ فن کا مظاہرہ نہیں کیا جا سکتا ۔ غنیۃ المنیہ کی ایک تحریر سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ سلطان فیروز تغلق کے عہد میں برعظیم میں مندرجہ ذیل ساز استعمال کیے جاتے تھے ۔

سنکھ ، تتر ، سنیگا ، باتھی ، مہری ، گھاگھری ، کرکنج ، جھکری ،
انکر ، جیکھت ، کنسال ، تال ، بھری ، بتوا ، کرر ، پکھاوج ،
مارک ، دیسی ، بوق ، جت ، اتوتی ۔

ان سازوں کے نام پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ سوائے ایک یا دو سازوں کے باقی تمام کے تمام ساز ہندوستانی تھے ۔

غنیۃ المنیہ کے آخری صفحات میں فاضل مصنف نے گانے والوں کے بعض عیوب پر بھی سیر حاصل تبصرہ کیا ہے ۔ اس کے خیال میں بعض گویے فنِ موسیقی سے نابلد محض ہیں اور جب وہ گاتے ہیں تو ان کی آوازیں جانوروں کی آوازوں سے مشابہ ہوتی ہیں ۔

---

[1] غنیۃ المنیہ ، مرتبہ خورشید لقا بیگم ، مخطوطہ شعبۂ تاریخ ، علی گڑھ ، مسلم یونیورسٹی ، ص ۱۱۱ - ۱۱۰ ۔

[2] غنیۃ المنیہ ، مرتبہ خورشید لقا بیگم ، مخطوطہ شعبۂ تاریخ ، علی گڑھ ، مسلم یونیورسٹی ، ص ۵۷ ۔

غنیۃ المنیہ کے مطالعہ کے بعد یہ بات ایک قاری کے دل میں کھٹکتی ہے کہ فاضل مصنف نے کسی موقع پر بھی بابائے موسیقی امیر خسروؒ کا ذکر نہیں کیا ۔ غنیۃ المنیہ ۴ - ۱۳۷۳ء کی تصنیف ہے اور امیر خسرو کا سالِ وفات ۱۳۲۴ء ہے ۔ فاضل مصنف نے کتاب کے دیباچہ میں اس بات کا ذکر صراحت کے ساتھ کیا ہے کہ وہ کتاب کی تصنیف کے وقت بوڑھا ہو چکا ہے ۔ اس حساب سے وہ امیر خسروؒ کی وفات کے وقت جوان ہوگا ۔ ہم عصر ہونے کے باوجود اس نے بابائے موسیقی کا ذکر غنیۃ المنیہ میں نہیں کیا ۔ اس بخل کو ہم پیشہ ورانہ یا ہم عصرانہ چشمک کے علاوہ اور کیا نام دے سکتے ہیں ۔

فرید الزمان فی معرفت الالحان

اس کتاب کا کوئی مخطوطہ تا دمِ تحریر ہمارے علم میں نہیں ہے ۔ اگر صاحبِ غنیۃ المنیہ اس کتاب کا ذکر اپنی تصنیف کے دیباچہ میں نہ کرتا تو ہمیں یہ بھی معلوم نہ ہو سکتا کہ اس نام کی کوئی کتاب فنِ موسیقی پر لکھی گئی تھی : فرید الزمان فی معرفت الالحان جیسا کہ نام سے ظاہر ہے عربی زبان میں لکھی گئی تھی ۔ بعد ازاں سلطان فیروز شاہ تغلق کے حکم سے کسی ماہر فن نے اس کا فارسی زبان میں ترجمہ کر دیا[1] ۔ اس سے زیادہ اس کتاب کے متعلق اور کچھ معلوم نہیں ہو سکا ۔

کنز التحف

سلطان فیروز تغلق کے عہدِ حکومت میں فنِ موسیقی پر کنزالتحف کے نام سے ایک رسالہ لکھا گیا تھا ۔ جس کا سالِ تالیف اس مصرع سے عیاں ہے :

آن روز کزاحداث جہاں مہمل بود

۷۵۶ھ

اس حساب سے یہ رسالہ سلطان موصوف کے ابتدائی عہدِ حکومت میں احاطۂ تحریر میں آیا تھا ۔ مصنف کا نام متن میں کسی جگہ نہیں آیا اور کسی دوسرے ذریعے سے بھی اس کا نام معلوم نہیں ہو سکا ۔ کنزالتحف کا ایک

---

[1] ۔ غنیۃ المنیہ ، مرتبہ خورشید لقا بیگم ، مخطوطہ شعبۂ تاریخ ، علی گڑھ ، مسلم یونیورسٹی ، ص ۳ ۔

قلمی نسخہ انڈیا آفس لائبریری، لندن میں موجود ہے اور اس کا متن ۲۷ اوراق پر پھیلا ہوا ہے[۱]۔

سنگیت شاستر

نیاز فتحپوری صاحب رقمطراز ہیں کہ فیروز شاہ تغلق کو کانگڑہ سے ۱۳۰۰ کے قریب سنسکرت زبان میں لکھے ہوئے مخطوطے ملے تھے۔ جن میں ہندوستانی موسیقی پر ایک اہم مخطوطہ سنگیت شاستر بھی تھا۔ سلطان نے اس کا فارسی میں ترجمہ کروایا[۲]۔

سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء اور ان کے مریدوں کو سماع کے ساتھ بے حد شغف تھا۔ فیروز شاہ کے عہد حکومت میں سلطان المشائخ کے دو جلیل القدر خلیفے حضرت قطب الدین منورؒ اور حضرت نصیر الدین چراغ دہلی اقلیم معرفت کے تاجدار سمجھے جاتے تھے اور ان دنوں بزرگوں کو اپنے شیخ کی طرح سماع سے بڑی رغبت تھی۔ تاریخ فیروز شاہی کے مصنف کو دونوں بزرگوں کی خدمت میں نیاز حاصل تھا۔ وہ اول الذکر بزرگ کا مرید تھا اور مؤخر الذکر بزرگ کی خدمت میں اکثر حاضری دیتا رہتا تھا۔ شمس سراج عفیف نے ہانسی میں اپنے مرشد کی خانقاہ میں منعقد ہونے والی ایک محفل سماع کا ذکر بڑے دلکش اور پر اثر انداز میں کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ شیخ نصیر الدین چراغ دہلیؒ سلطان فیروز شاہ کی معیت میں سندھ سے دہلی جاتے ہوئے جب ہانسی سے گزرے تو وہ شیخ قطب الدین منورؒ کی ملاقات کو تشریف لے گئے۔ جونہی انہیں یہ معلوم ہوا کہ چراغ دہلیؒ تشریف لا رہے ہیں تو فوراً برہنہ پا اُن کے استقبال کے لیے اپنی خانقاہ سے باہر نکل آئے۔ عندالملاقات دونوں بزرگ پہلے ایک دوسرے سے بغلگیر ہوئے بعد ازاں ایک دوسرے کے پاؤں چھونے کی کوشش کی۔ اس کے بعد دونوں بزرگ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ہوئے خانقاہ میں آئے اور سلطان المشائخ کو یاد کرکے رونے لگے۔

---

[۱] ۔ ایتھے، کیٹیلاگ آف پرشین مینو سکرپٹس ان انڈیا آفس لائبریری مطبوعہ آکسفورڈ ۱۹۰۳ء مخطوطہ نمبر ۲۷۶۳۔

[۲] ۔ نیاز فتحپوری، ماہنامہ نیرنگ خیال لاہور، موسیقی نمبر، نومبر ۱۹۶۰ء، ص ۱۰۸۔

بعد زمانی قوالان از غیب رسیده ہر دو بزرگوار در عالم استماع سماع مستغرق گشتہ چند روز ہر دو بزرگوار در مقامات سماع مشغول بودند ۔ آری عجیب کاری و بوالعجب اسراری ۔ در سماع کم کسی بدین سوا اسرار رسد چنانچہ درین باب خدمت شیخ جمال الدین احمد ہانسوی جد خدمت شیخ قطب الدین منور علیہما الرحمتہ و الغفران فرمودہ ۔

رباعی ۔

برتارک دل سماع چون تاج بود
بردوش دل حزین چون دیباج بود

از احمد خستہ بشنو این زمزمہ را
مرمردان را سماع چون معراج بود

المقصود بطولہا و عزقبولہا بعد از فارغ شدن از سماع ہر دو بزرگوار طالب رضای غفار از عالم سکر در مقامات صحو آمدند[1] ۔

ترجمہ : تھوڑی دیر بعد قوال پہنچ گئے اور دونوں بزرگ سماع میں محو ہو گئے چند روز تک دونوں بزرگ سماع میں مشغول رہے ۔ واللہ ۔ اس سماع کی کیا بات تھی اور اس میں کیا کیا اسرار تھے شاید ہی کسی شخص کو ان دونوں کی طرح سماع میں اسرار کا انکشاف ہوا ہو ۔ اس ضمن میں حضرت شیخ قطب الدین منورؒ کے جدّ امجد شیخ جمال الدین ہانسوی نے کیا خوب فرمایا ہے ۔

قصہ مختصر ، خدا کی بخشش کے طالب یہ دونوں بزرگ سماع سے فارغ ہو کر حالتِ سُکر سے حالت صحو میں آئے ۔

حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ کا حضرت قطب منوّر ہانسویؒ کی معیت میں سماع سننا ہم عصر مورخ شمس سراج عفیف کی تاریخ فیروز شاہی سے

---

[1] ۔ شمس سراج عفیف ، تاریخ فیروز شاہی ، ص ۸۵ - ۵۴ -

ثابت ہے ۔ یہ محفل سماع دو چار گھنٹے تک نہیں بلکہ چند روز تک جاری رہی تھی ۔ ہمارے لیے یہ بالکل نئی بات ہے کیونکہ عام طور پر یہی کہا جاتا ہے کہ حضرت چراغ دہلیؒ سماع نہ سنتے تھے بلکہ اگر ان کی موجودگی میں کسی مجلس میں سماع شروع ہو جاتی تو آپ فوراً وہاں سے اٹھ جاتے تھے ۔ اخبار الاخیار میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی ان کے بارے میں رقم طراز ہیں :

> روزے بعضے از مریدانِ شیخ نظام الدین اولیاء مجلسی داشتند و از دف زنان سرودی می شنیدند ۔ شیخ نصیر الدین محمود در مجلس بود ، برخواست تا برآید ، یاران تکلیف نشستن کردند گفت خلاف سنت ست ، گفتند از سماع منکر شدی و از مشرب پیر برگشتی ، گفت حجت نمی شود دلیل از کتاب و حدیث می باید ، بعضے از غرض گویان این سخن بخدمت شیخ رسانیدند که شیخ محمود چنیں می گوید ، شیخ را صدق معاملہ او معلوم بود ، فرمود راست می گوید حق آنست کہ او می گوید[1] ۔

ترجمہ : ایک روز شیخ نظام الدین اولیاء کے بعض مریدوں نے ایک مجلس منعقد کی اور دف زنوں سے گانا سننے لگے تو شیخ نصیر الدین جو وہاں موجود تھے ، باہر نکلنے کے ارادہ سے اٹھ کھڑے ہوئے ۔ دوستوں نے انھیں بیٹھنے پر مجبور کرنا چاہا تو آپ نے فرمایا کہ یہاں خلاف سنت کام ہو رہا ہے ۔ انھوں نے کہا کہ کیا تم سماع کے منکر ہو گئے ہو اور اپنے شیخ کے مشرب سے منہ موڑ گئے ہو ؟ آپ نے کہا کہ شیخ کا فعل کوئی حجت نہیں ، قرآن اور حدیث سے دلیل دیجیے ۔ بعض غرض مندوں نے شیخ سے شکایت کی کہ شیخ محمود یوں کہتے ہیں ۔ شیخ چونکہ اُن کے حسنِ نیت کے قائل تھے اس لیے انھوں نے فرمایا کہ وہ ٹھیک ہی تو کہتا ہے کیونکہ حق بات وہی ہے جو اس نے کی ہے ۔

شیخ محمد اکرام صاحب نے بھی "آبِ کوثر" میں شیخ نصیر الدین چراغ دہلیؒ کے حالات کے ضمن میں یہی لکھا ہے کہ حضرت سلطان المشائخ نے اپنا

---

[1] ۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی ، اخبار الاخیار ، مطبوعہ دہلی ۱۳۳۲ھ ، ص ۸۲ ۔

جانشین اس شخص (چراغ دہلیؒ) کو بنایا تھا جو سماع کے خلاف تھا[۱] ۔ ہم شیخ عبدالحق محدثؒ اور شیخ محمد اکرام صاحب کی روایات پر حضرت چراغ دہلیؒ کے خلیفۂ اعظم اور جانشین حضرت بندہ نواز گیسو درازؒ کی اس روایت کو ترجیح دیتے ہیں جس میں آپ فرماتے ہیں :

> خواجۂ ما بتعمد نشنیدی و اگر کسی دف زنان پیش درآمدی منع ہم نہ کردے[۲] ۔

ترجمہ : ہمارے خواجہ عمداً مزامیر نہ سنتے تھے لیکن اگر کوئی دف بجاتا ہوا اُن کے دروازے کے سامنے آ جاتا تھا تو اُسے منع بھی نہیں کرتے تھے ۔

حضرت سید محمد حسینی بندہ نواز گیسو دارزؒ کا شمار فیروزی عہد کے نامور اولیاء اللہ میں ہوتا ہے۔ آپ حضرت نصیرالدین چراغ دہلیؒ کے خلیفۂ اعظم تھے اور اپنے مرشد کے حکم سے عوام کی رشد و ہدایت کے لیے دکن چلے گئے تھے ۔ ان کی خانقاہ ، جو گلبرگہ شریف میں ہے ، دکن کا سب سے بڑا روحانی مرکز تصور ہوتی ہے ۔ حضرت بندہ نواز گیسو درازؒ کو سماع سے جو شغف تھا اس کا ذکر آئندہ سطور میں آئے گا ۔

یہ عجیب بات ہے کہ بقول شیخ محمد اکرام صاحب حضرت سلطان المشائخؒ نے اس شخص کو اپنا جانشین بنایا تھا جو علانیہ سماع کا منکر تھا ۔ لیکن یہ اس سے بھی عجب بات ہے کہ حضرت چراغ دہلیؒ کا جانشین وہ شخص ہوا جو علانیہ یہ کہا کرتا تھا :

> فتح کار من بیشتر در تلاوت و سماع بود[۳] .

ترجمہ : ہمارے کام کی زیادہ تر کشودگی تلاوت اور سماع کے ذریعے ہوئی ہے ۔

---

۱ - شیخ محمد اکرام ، آبِ کوثر ، مطبوعہ ، لاہور ۱۹۵۲ء ، ص ۲۷۵ -

۲ - شاہ محمد علی سامانی ، سیر محمدی ، مطبوعہ الٰہ آباد ۱۳۴۷ھ ، ص ۷۰ -

۳ - ایضاً ، ص ۷۱ -

شاہ محمد علی سامانی لکھتے ہیں کہ حضرت گیسو درازؒ کی حضرت برہان الدین غریبؒ کے ایک خلیفہ سید نصیر کے ساتھ رشتہ داری تھی۔ آپ اکثر ان کے ہاں تشریف لے جاتے اور محفل سماع میں شریک ہوتے۔[۱]

حضرت گیسو درازؒ ہندی اور فارسی دونوں زبانوں میں موقع کی مناسبت سے سماع سننا پسند فرماتے تھے۔ شاہ محمد علی سامانی لکھتے ہیں کہ حضرت گیسو درازؒ فرمایا کرتے تھے۔

اغلب شنیدن سماع بر شعر و غزل و ابیات فارسی بودے و می فرمودند ہندی بیشتر نرم و مرق می باشد و آہنگ بر وفق او نرم می باشد۔ اشارات بخرابی و عاجزی و انکساری می کند۔ بضرورت مرد صوفی را آنجا میل بیشتر می باشد۔ اما ہنر سرود و ادای ضربات موسیقار در پارسی ست آنجا لذتی و ذوقی دیگر است۔[۲]

ترجمہ: آپ زیادہ تر فارسی شعر، غزل و ابیات سنا کرتے تھے۔ ہندی کے متعلق آپ فرمایا کرتے تھے کہ وہ نرم اور رقت پیدا کرنے والی ہے اور راگ بھی اس کے مطابق نرم ہوتا ہے، اور عاجزی، خرابی اور انکساری کی طرف اشارہ کرتا ہے ضرورتاً مرد صوفی کی طبیعت کا میلان بھی ادھر زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن ہر سرود کا ہنر اور موسیقار کے جذبات کا ادا کرنا فارسی ہی میں ممکن ہے۔ وہاں لذت اور ذوق دوسرا ہی ہوتا ہے۔

حضرت گیسو درازؒ کی محفلِ سماع میں خوشبو اور روشنی کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ آپ کے ملفوظات نگار لکھتے ہیں کہ آپ کی محفلِ سماع میں کئی جگہ عود جلا کر رکھی جاتی تھی اور اگر رات کے وقت مجلس منعقد ہوتی تو روشنی کا بھی خاطر خواہ انتظام کیا جاتا تھا[۳]۔

۱۔ ایضاً، ص ۶۸۔

۲۔ شاہ محمد علی سامانی، سیر محمدی، مطبوعہ الہ آباد۔ ۱۳۴۷ھ ص ۷۱۔

۳۔ ایضاً، ص ۷۱۔

سلطان فیروز تغلق کے عہد میں دہلی میں ابراہیم نامی ایک چنگ نواز رہتا تھا جس کے کمالِ فن کا دور دور تک شہرہ تھا - ایک بار وہ بیمار ہوا تو بغرض علاج مولانا صدرالدین کی خدمت میں حاضر ہوا- ابراہیم کے پاس ان دنوں پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی اس لیے مولانا صدر الدین کی خدمت میں جاتے ہوئے اپنا چنگ بھی ساتھ لیتا گیا - مولانا نے تشخیص مرض کے بعد دوائی دی تو ابراہیم نے معاوضے میں چنگ بجانے کی پیش کش کی - اتفاق سے اس وقت حضرت گیسو درازرح اور مولانا علاء الدین بھی وہاں موجود تھے - ابراہیم اشارہ پاتے ہی تاروں پر انگلیاں دوڑانے لگا - اس نے چنگ کے تاروں سے دف اور تال جیسی آواز کچھ اس انداز سے نکالی کہ مولانا صدر الدین کا بیٹا یوسف پھڑک کر زمین پر گرا - حاضرین اسے بے ہوشی کے عالم میں مجلس سے اٹھا کر باہر لے گئے - حضرت گیسو درازرح بھی جب تک چنگ بجتا رہا ، بے خودی کے عالم میں رہے - آپ فرماتے ہیں کہ انھوں نے اس کے بعد کبھی چنگ نوازی کا ایسا مظاہرہ نہیں دیکھا -[1]

حضرت گیسو درازرح کے ملفوظات نگار شاہ محمد علی سامانی نے حضرترح کی زبان سے ایک محفل سماع کی کیفیت ان الفاظ میں سنی تھی -

یکبار سماعے بشنویم کہ جملہ مزامیر در آن باشد ، خانۂ مولانا صدر الدین اختیار کردیم - جملہ مزامیر جمع کردیم - در بستیم و دیوار ہا بلند بود ، سہ شبانروز سماع شنیدیم ، خلق گرد برگرد خانہ ہجوم کردند ، این خبر بحضرت بندگی شیخ رسید چون پایبوس کردیم فرمودند سید محمد ہم چنیں سماع مشنو - از ان وقت باز مزا میر نہ شنیدیم -[2]

ترجمہ : ایک بار ہم نے سماع سنی جس میں جملہ مزامیر موجود تھے - اس کام کے لیے مولانا صدر الدین کا گھر منتخب کیا - ہم نے تمام مزامیر جمع کیے - گھر کے دروازے بند کر لیے - دیواریں ویسے ہی بلند تھیں - چنانچہ تین شب و روز سماع جاری رہی - گھر کے باہر لوگوں کے ٹھٹ لگ گئے تھے -

---

[1] - شاہ محمد علی سامانی ، سیر محمدی ، مطبوعہ الہ آباد ۱۳۴۷ھ ص ۷۰ -

[2] - شاہ محمد علی سامانی ، سیر محمدی ، مطبوعہ الہ آباد - ۱۳۴۷ھ ص ۷۰-۷۱ -

> یہ بات حضرت چراغ دہلیؒ تک پہنچی ، چنانچہ جب میں پا بوسی کے لیے حاضر ہوا تو فرمانے لگے ، "سید محمد اس طرح کی سماع نہ سنا کرو"۔ اس کے بعد ہم نے دوبارہ مزامیر کے ساتھ سماع نہیں سنی ۔

اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ حضرت چراغ دہلیؒ نے حضرت گیسو درازؒ کو سماع بالمزامیر سے منع فرمایا تھا ۔ بغیر مزامیر کے سماع سننے سے نہیں روکا ، ہم حضرت چراغ دہلیؒ کے متعلق حضرت گیسو درازؒ کا یہ بیان نقل کر چکے ہیں :

خواجہ ما بتعمد نشنیدی و اگر کسی دف زنان پیش در درآمدی منع ہم نہ کر دے ۔

> ترجمہ : ہمارے خواجہ عمداً مزامیر نہ سنتے تھے لیکن اگر کوئی دف بجاتا ہوا ان کے دروازے پر آ نکلتا تھا تو اسے منع بھی نہیں کرتے تھے ۔

شیخ کے سماع بالمزامیر سے منع کرنے پر حضرت گیسو درازؒ نے بھی یہی وطیرہ اختیار کر لیا تھا ۔ آپؒ کے ملفوظات نگار شاہ محمد علی سامانی رقمطراز ہیں :

در مجلس حضرت مخدوم رضی اللہ عنہ مزامیر نبودے ،اگر کسے پیش مزامیر زدے منع ہم نہ کر دے ۔[1]

> ترجمہ : ہمارے مخدوم رضی اللہ عنہ کی مجلس سماع میں مزامیر نہ ہوتے تھے لیکن اگر کوئی ان کے سامنے مزامیر بجاتا تو اسے منع بھی نہ کرتے تھے ۔

قریب قریب یہی الفاظ حضرت بندہ نوازؒ کے ملفوظات جوامع الکلم میں بھی ملتے ہیں ۔[2] جوامع الکلم میں سماع کے متعلق درجنوں واقعات ملتے ہیں ، جن کے تذکرہ کے لیے ایک الگ دفتر درکار ہے ۔

---

[1] ۔ ایضاً ، ص ٦٩ ۔

[2] ۔ محمد اکبر حسینی ، جوامع الکلم ، مطبوعہ حیدر آباد ١٢٥٦ھ ، ص ٢٦٣ ۔

سلطان فیروز تغلق حالانکہ خود سماع سنتا تھا لیکن اسے یہ بات گوارا نہ تھی کہ لوگ سماع کے دوران بے خود ہو کر شور و غوغا کریں ۔ حضرت گیسو درازؒ کے کسی مخالف نے ایک بار سلطان سے اس بات کی شکایت کی کہ آپ سماع کے دوران بہت غوغا کرتے ہیں ۔ اس پر سلطان نے یہ حکم دیا آپ آئندہ خلوت میں سماع سنا کریں ۔ اس کے بعد آپ نے یہ اہتمام کیا کہ خود تو قوالوں کو ساتھ لے کر حجرہ میں بیٹھ جاتے اور آپ کے صاحبزادہ اور مرید حجرہ کے باہر بیٹھ جاتے ، درمیان میں پردہ حائل رہتا تھا ۔[1] سیر محمدی کے مطالعہ سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ حضرت گیسو درازؒ کو تا دم واپسین سماع سے دلچسپی رہی ۔

بارشِ رحمت و انوار و کرم موسیقی
باعثِ خاتمہ کرب و الم موسیقی

(شاہین غازی پوری)

---

[1] ۔ شاہ محمد علی سامانی ، سیر محمدی ۔ مطبوعہ الہ آباد ۔ ۱۳۴۷ھ ، ص ۶۹ ۔

حضرت بندہ نواز گیسو درازؒ کے زمانے میں موسیقی

حضرت سید محمد الحسینی المعروف بہ بندہ نواز گیسو دراز علیہ الرحمہ کا شمار ان اولیاء کبار میں ہوتا ہے جنھوں نے مسلمانان پاک و ہند کی دینی اور سماجی تاریخ میں اپنی سیرت اور کردار کے انمٹ نقوش چھوڑے ہیں ۔ موصوف ۱۰ اگست ۱۳۲۰ء کو خسرو خاں کے دور حکومت میں دہلی میں پیدا ہوئے ۔ ان کی ولادت کے چند سال بعد سلطان محمد بن تغلق نے دہلی کی بجائے دولت آباد کو دارالحکومت قرار دیا اور دہلی کے باشندوں کو وہاں جانے کا حکم دیا ۔ سید بندہ نوازگیسو دراز اپنے والد محترم سید محمد یوسف المعروف بہ راجو قتالؒ کی معیت میں دولت آباد تشریف لے گئے[۱] ۔

حضرت گیسو درازؒ نے ابتدائی تعلیم اپنے والد بزرگوار سے حاصل کی ۔ ابھی آپ دس برس کے تھے کہ شفقتِ پدری سے محروم ہوگئے ۔ والد کی وفات کے بعد ان کی تربیت کا بار ان کے ماموں ملک الامرا سید ابراہیم کے کندھوں پر پڑا اور وہ پانچ سال تک اپنے بھانجے کی کفالت کرتے رہے ۔ حضرت گیسو دراز پندرہ سال کے ہوئے تو ان کی والدہ ماجدہ اپنے بھائی سے ناراض ہو کر اپنے بیٹے سمیت دہلی چلی آئیں[۲] ۔ دہلی اس زمانے میں علم و ادب کا گہوارہ سمجھا جاتا تھا اور ان دنوں وہاں شیخ نصیر الدین چراغ دہلی رحمہ اللہ کے نامور مرید قاضی عبدالمقتدر شریحی کے علم و فضل کا بڑا شہرہ تھا ۔ قاضی صاحب اپنی فہم و فراست ، فصاحت اور بلاغت کے لیے ضرب المثل تھے اور ان کا کلام علمی و ادبی حلقوں میں بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا[۳] ۔ حضرت گیسو درازؒ کو ان کی صحبت میسر آئی اور انھوں نے قاضی صاحب کی خدمت میں رہ کر علوم ظاہری کی تکمیل کی ۔

---

۱ ۔ شیخ محمد اکرام ، آبِ کوثر : لاہور : ۱۹۵۲ء ، ص ۔ ۳۱ ۔
۲ ۔ ایضاً ۔
۳ ۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی ، اخبار الاخیار ، دہلی ، ۱۳۳۲ھ ، ص ۱۵۰ ۔

حضرت بندہ نواز پندرہ یا سولہ سال کی عمر میں حضرت چراغ دہلیؒ سے متعارف ہوئے اور ۲۹ فروری ۱۳۳۶ء کو ان کے مرید ہوگئے[1] ۔ بیعت کے بعد انھوں نے اپنے مرشد کی نگرانی میں منازل سلوک طے کرنا شروع کیں ۔ ان کا جذبہ اور ذوق و شوق دیکھ کر حضرت چراغ دہلیؒ فرمایا کرتے تھے کہ ستر برس کے بعد ایک لڑکے نے پھر مجھ میں شوریدگی پیدا کر دی ہے اور پہلے زمانے کے واقعات مجھے یاد دلا دیے ہیں[2] ۔

حضرت چراغ دہلیؒ نے ۴ ستمبر ۱۳۵۷ء کو انتقال فرمایا اور اس سے تین روز قبل انھوں نے حضرت گیسو درازؒ کو خلافت عطا کی ۔ حضرت گیسو درازؒ نے ۴۴ سال تک دہلی میں مسندِ ارشاد کو زینت بخشی ۔ جب ۱۳۹۸ء میں امیر تیمور کے حملے کا غلغلہ بلند ہوا تو انھوں نے ۸۰ برس کی عمر میں دہلی کو خیر باد کہا اور گجرات کے راستے دکن کی طرف چل پڑے ۔ آپ نے دولت آباد میں چندے قیام کے بعد بہمنی سلاطین کے دارالحکومت گلبرگہ کو زینت بخشی اور وہیں مستقل قیام فرمایا ۔ حضرت کا وصال ۱۰۵ سال کی عمر میں ۱۴۲۲ء میں ہوا[3] ۔ گلبرگہ میں ان کا مزار مرجع خلایق ہے ۔

حضرت گیسو درازؒ کے ملفوظات ان کے فرزندِ ارجمند محمد اکبر حسینی نے "جوامع الکلم" کے عنوان سے جمع کیے تھے ۔ اسی طرح ان کے ایک مریدِ باصفا محمد علی سامانی نے ان کے ملفوظات اور سوانح "سیر محمدی" کے نام سے مرتب کیے ہیں ۔ یہ دونوں کتابیں طبع ہو چکی ہیں ۔

حضرت گیسو درازؒ کو سماع بڑی مرغوب تھی اور آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ انھوں نے سلوک کی منزل تلاوتِ قرآن حکیم اور سماع سے طے کی ہے[4] ۔ ان کے ملفوظات میں سماع کے بارے میں بڑی دلچسپ حکایتیں درج ہیں ، جن میں سے چند ایک پیشِ خدمت ہیں ۔

---

[1] ۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن ، بزم صوفیہ ، اعظم گڑھ ، ۱۹۴۹ء ، ص ۸۵ ۔

[2] ۔ محمد علی سامانی ، سیر محمدی ، الہ آباد ، ۱۳۲۴ھ ، ص ۱۲ ۔

[3] ۔ محمد اسحٰق ، انڈیاز کونٹری بیوشن ٹو دی سٹڈی آف حدیث لٹریچر ، ڈھاکا ، ۱۹۵۵ء ، ص ۶۰ ۔

[4] ۔ محمد علی سامانی ، سیر محمدی ، ص ۱۰ ۔

— می فرمودند فتح کار من بیشتر در تلاوت و سماع بود ۔

گجرات کے سفر کے دوران ایک روز ہندو عورتوں کے گانے کی آواز حضرت گیسو درازؒ کے کانوں میں پڑی تو انہوں نے ان کے گانے کے جواز میں یہ واقعہ بیان فرمایا کہ ایک دفعہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کہیں تشریف لے جا رہے تھے کہ قریش کی بچیوں نے انہیں دیکھ کر عہد جاہلیت کے اشعار گانے شروع کیے ۔ جب ان لڑکیوں نے یہ مصرع پڑھا ۔

و فینا نبی یعلم ما فی غد

تو آپ نے فرمایا کہ ان الفاظ کو چھوڑ دو اور جو کچھ پہلے گا رہی تھیں وہی گاتی جاؤ[۱] ۔

امام محمد بن اسمٰعیل بخاریؒ نے اپنی الصحیح میں " کتاب النکاح باب ضرب الدف" کے تحت یہ واقعہ نقل کیا ہے[۲] کہ ربیع فرماتی ہیں کہ جس وقت ان کی شادی ہوئی تو اس موقعہ پر چھوٹی چھوٹی بچیاں دف بجا رہی تھیں اور اپنے آبا و اجداد کی بہادری کا ذکر کر رہی تھیں ۔ اتنے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس طرف آ نکلے تو ان میں سے ایک بچی نے یہ مصرع پڑھنا شروع کیا ۔

و فینا نبی یعلم ما فی غد

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے مخاطب کرکے فرمایا کہ یہ مصرع ترک کر دو اور جو پہلے گا رہی تھیں وہی گاتی جاؤ ۔ ہمارے محدثین نے اس بات کی صراحت کر دی ہے کہ وہ بچیاں بہت کم سن اور نابالغ تھیں اسی وجہ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں گانے سے منع نہیں فرمایا اور اگر وہ بالغ ہوتیں تو حضورؐ کسی طرح بھی انہیں گانے کی اجازت نہ دیتے[۳] ۔

ایک بار سماع کے موضوع پر گفتگو فرماتے ہوئے حضرت گیسو درازؒ نے فرمایا کہ تان اور لے مرتب کرتے وقت اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ

---

۱ ۔ جوامع الکلم ، ص ۱۸ ۔

۲ ۔ محمد حامد صدیقی ، جوامع الکلم ، فٹ نوٹ ، ص ۱۸ ۔

۳ ۔ جوامع الکلم ، ص ۱۲۱ ۔

وہ غزل کے مضمون کے مطابق ہو ، مثلاً اگر اشعار میں بیزاری ، تضرع یا عجز و انکسار کا بیان ہو تو پھر لے بھی ویسی ہی ہونی چاہیے اور اگر اشعار میں ترفع ، استغنا اور تعاظم کا ذکر ہو تو پھر لے بھی ویسی ہی ہونی چاہیے۔ اسی طرح جب کسی معشوق کے خد و خال یا ناز و کرشمہ کا ذکر آئے تو پھر سر اور تال بھی اسی مناسبت سے ہونے چاہئیں۔ اسی ضمن میں آپ نے فرمایا کہ حوض سلطان سے ایک کنیز پانی کا گھڑا بھر کر لے جایا کرتی تھی۔ خدا نے اسے بڑی اچھی شکل و صورت دی تھی اور وہ بڑے ناز و نخرے سے قدم اٹھاتی اور گانا گاتی۔ اتفاق سے ایک درویش حوض سلطان کے کنارے رہتا تھا اور اُسے موسیقی میں بڑا کمال حاصل تھا۔ ایک روز وہ حضرت گیسو درازؒ سے ملنے آیا تو انھوں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ اس ساری کیفیت کو صوت اور ساز میں باندھے۔ اس نے اسی وقت اس کیفیت کو ایسے انداز سے ادا کیا کہ انسانی طاقت سے باہر معلوم ہوتا تھا۔ اُسے سن کر حضرت گیسو درازؒ کی زبان سے بیساختہ سبحان اللہ نکلا[1]۔

ایک روز حضرت گیسو درازؒ سماع کے رموز و اسرار بیان فرما رہے تھے، تو اسی ضمن میں انھوں نے فرمایا کہ اُن کے ایک دوست مولانا علاء الدین نے مولانا جمال الدین مغربی سے پوچھا کہ اگر وہ محفل سماع منعقد کریں اور انھیں بلائیں تو کیا وہ آئیں گے۔ انھوں نے جواب دیا کہ وہ ضرور آئیں گے۔ بعد ازاں مولانا جمال الدین مغربی نے فرمایا کہ سماع کے دوران صوفی جو ہاتھ پاؤں ہلاتے ہیں وہ انھیں ہذیان سمجھتے ہیں۔ مولانا علاء الدین نے جواب دیا کہ ان کے نزدیک اس کی کوئی حقیقت نہیں لیکن وہ اتنا ضرور جانتے ہیں کہ نغمہ میں تاثیر ہوتی ہے اور اس سے انکار ممکن نہیں ، نیز انھوں نے بغداد میں صوفیوں کو سماع سنتے ہوئے دیکھا ہے اور وہ اپنی جگہ سے مطلق حرکت نہیں کرتے تھے البتہ کبھی کبھی ان کے منہ سے اللہ اللہ سنائی دیتا تھا اور اُن کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے تھے۔ جس طرح کی حرکتیں ہمارے ہاں کے صوفیاء سماع کے دوران کرتے ہیں انھوں نے اس طرح کی باتیں اُن میں نہیں دیکھیں[2]۔

---

[1] - جوامع الکلم ، ص ۱۰۱ -

[2] - ایضاً ، ص ۱۰۹ -

حضرت گیسو درازؒ فرماتے ہیں کہ ایک بار حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیاؒ نے فرمایا کہ ایک بزرگ نے یہ وصیت کی کہ جب وہ فوت ہو جائے تو سات روز تک اس کی میت کے قریب ہنگامۂ سماع برپا کیا جائے اور بعد ازاں اسے دفن کیا جائے۔ جب وہ بزرگ فوت ہوا تو حسبِ وصیت اس کی میت کے پاس محفل سماع منعقد ہوئی۔ حضرت سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ ساتویں روز وہ اٹھ کر رقص کرنے لگا اور بالآخر چارپائی پر گر گیا۔

یہ واقعہ بیان کر کے حضرت سلطان المشائخؒ نے فرمایا کہ ان کی بھی بڑی خواہش ہے کہ تین روز تک ان کی میت کے پاس مجلسِ سماع منعقد کی جائے اور پھر انہیں دفن کیا جائے۔ حضرت سلطان المشائخ نے اس وصیت پر عمل کرنے کی ذمہ داری مولانا شہاب الدین پر ڈالتے ہوئے فرمایا کہ وہ اس پر عمل کریں کیونکہ ہو سکتا ہے کہ ان کے خدام اس وصیت پر عمل نہ کریں۔

جب حضرت سلطان المشائخؒ کا انتقال ہوا تو شیخ رکن الدین ملتانیؒ نے نماز جنازہ پڑھائی۔ مولانا شہاب الدین قوالوں کو لے کر آگے بڑھے اور انہوں نے شیخ رکن الدین ملتانیؒ کو اپنے مرشد کی وصیت یاد دلائی۔ مولانا شہاب الدین کی بات سن کر شیخ نے فرمایا کہ یہ درست ہے یہ ان کی وصیت تھی لیکن اگر اس پر عمل کیا گیا تو حضرت سلطان المشائخ اٹھ کر رقص کرنے لگیں گے اور اس سے ایک بڑا فتنہ کھڑا ہو جائے گا۔ اس لیے خدا کے واسطے سماع کی محفل منعقد نہ کریں۔ مولانا شہاب الدین نے عرض کیا کہ انہوں نے اس کی وصیت فرمائی تھی اور انہیں اس پر عمل کرنے کا ذمہ دار ٹھہرایا تھا۔ شیخ رکن الدینؒ نے فرمایا کہ وہ اس کے ضامن ہیں اور اگر قیامت کے دن کوئی باز پرس ہوئی تو اس کا جواب وہ دیں گے۔ حضرت گیسو دراز فرماتے ہیں کہ سلطان محمد اس وقت وہاں موجود نہ تھا اور حضرت سلطان المشائخ کی تدفین کے بعد جب یہ بات اسے معلوم ہوئی تو اس نے اظہارِ افسوس کرتے ہوئے کہا کہ یہ بات انہوں نے اسے پہلے کیوں نہ بتائی، اگر اسے بر وقت اس کی اطلاع مل جاتی تو وہ اس وصیت پر ضرور عمل کرتا[1]۔

حضرت گیسو درازؒ نے ایک روز یہ واقعہ بیان فرمایا کہ حضرت ابو سعید ابو الخیرؒ کے زمانے میں ایک طنبورہ نواز تھا اور جب وہ بوڑھا

---

[1] ایضاً، ص ۱۳۱-۱۳۲۔

ہوگیا تو اُس کے گھر والوں نے اُسے یہ کہہ کر گھر سے نکال دیا کہ وہ بھیک مانگ کر اپنی گذر بسر کر لیا کرے۔ وہ بوڑھا اپنا طنبورہ لے کر قبرستان میں جا بیٹھا اور خدا کو مخاطب کرکے کہنے لگا کہ اس نے سالہا سال تک اس کے بندوں کے سامنے طنبورہ بجایا ہے اور اب جب وہ بوڑھا ہوگیا ہے تو اس کا کوئی قدر دان باقی نہیں رہا۔ اس نے خدا کو مخاطب کرکے کہا کہ آج وہ اسے خرید لے اور اب وہ صرف خدا کے لیے ہی طنبورہ بجایا کرے گا۔ اس کے بعد اُس نے خدا تعالیٰ کو مخاطب کرکے یہ رباعی گانا شروع کی۔

مقبول تو جز مقبل جاوید نشد
و ز لطف تو ہیچ بندہ نومید نشد
عونت بکدام ذرہ پیوست دمی
کان ذرہ بہ از ہزار خورشید نشد

حضرت گیسو درازؒ فرماتے ہیں کہ وہ ساری رات یہی رباعی گاتا رہا اور جب سورج طلوع ہوا تو وہ طنبورہ اپنے سر کے نیچے رکھ کر سو گیا۔ اسی دوران میں ایک شخص حضرت ابو سعید ابو الخیرؒ کی خدمت میں ایک ہزار دینار لے کر حاضر ہوا۔ ان کے خادم خواجہ حسن نے اس رقم کو خانقاہ کے اخراجات کے لیے اُٹھانا چاہا تو حضرت نے فرمایا کہ اُسے یہیں رہنے دے۔ کچھ دیر بعد انھوں نے خواجہ حسن کو طلب کیا اور اُسے کہا کہ فلاں قبرستان میں جائے۔ وہاں ایک بوڑھا طنبورہ سر کے نیچے رکھ کر سو رہا ہے اس سے کہے کہ خدا تعالیٰ نے اس کی طنبورہ نوازی قبول کر لی ہے اور اُسے سلام دیا ہے اور یہ رقم اس کے لیے بھیجی ہے۔ خواجہ حسن نے اس طنبورہ نواز کو وہ رقم دیتے ہوئے کہا کہ آئندہ اُسے جس چیز کی ضرورت ہو وہ آکر شیخ ابو سعید ابو الخیر سے لے جایا کرے[1]۔

ایک روز حضرت گیسو درازؒ نے فرمایا کہ صوفی کا ذوق موسیقار کی لے اور ضربوں پر نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کی نظریں کسی اور ہی چیز پر لگی رہتی ہیں اور اس کا معاملہ اس وقت خدا کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس لیے اگر اس عالم میں ایک لفظ یا ایک تان اُس کے حال کے مطابق ادا ہو جائے تو اس کے

---

[1] ۱۔ ایضاً، ۱۳۲۔

ذوق کا سامان مہیا ہو جاتا ہے تو اُسے اس سے بے حد مسرت ہوتی ہے کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ صوفیاء رونے لگتے ہیں ، نعرے لگاتے ہیں ، شور وغوغا کرتے ہیں ، اپنے کپڑے پھاڑ ڈالتے ہیں اور بیہوش ہو جاتے ہیں ۔

حضرت نظام الدین اولیاؒ کی وفات کے چند روز بعد اُن کے مریدوں نے ان کی خانقاہ میں مجلسِ سماع منعقد کی ۔ قوال کافی دیر تک گاتے رہے لیکن کسی شخص پر کوئی اثر نہ ہوا ۔ اچانک ہی حسن میمندی اُس طرف آ نکلے اور انہوں نے آتے ہی ایک نعرہ مارا اور شیخ کے مزار کے قریب سربسجود ہو کر ہندی زبان میں— سوبھلا مائی سوبھلا ۔ کہا ۔ حسن میمندی کی زبان سے یہ ہندی کلمات سن کر حاضرین بے اختیار رونے لگے اور سماع میں لطف آنے لگا[1] ۔

حضرت گیسو درازؒ فرماتے ہیں کہ ایک بار حضرت نظام الدین اولیاؒ کہیں تشریف لے جا رہے تھے کہ راستے میں ایک رہٹ چل رہا تھا ۔ جب حضرت نظام الدینؒ پانی پینے کے لیے اس کنویں پر رکے تو کسان نے اپنے بیلوں سے کہا ۔ باہر ہو باہر ۔ اتنی سی بات سے حضرت نظام الدینؒ کی حالت متغیر ہوگئی اور جب خواجہ اقبال اور خواجہ مبشر نے شیخ کی یہ حالت دیکھی تو انہوں نے انھی الفاظ کو بار بار دہرانا اور گانا شروع کیا اور جب تک حضرت نظام الدینؒ اپنی منزل تک نہیں پہنچ گئے اس وقت تک وہ انھی الفاظ سے لطف اندوز ہوتے رہے[2] ۔

حضرت گیسو درازؒ فرماتے ہیں کہ قاضی حمید الدین ناگوریؒ مجلسِ سماع میں تشریف فرما تھے کہ ایک درویش نے کوئی ناپسندیدہ حرکت کی ۔ قاضی صاحب کے ایک خادم نے اُسے مجلس سے نکال دیا جب مجلسِ سماع برخاست ہوئی تو اس درویش نے اس خادم کی شکایت کرتے ہوئے کہا کہ جب وہ بہشت میں ایک قدم رکھ چکا تھا اور دوسرا رکھنے والا تھا اس شخص نے اُسے مجلس سے باہر نکال دیا ۔ قاضی صاحب نے خادم کو بلا کر پوچھا کہ اس نے ایسا کیوں کیا ؟ خادم نے عرض کی کہ آپ نے ہی فرمایا تھا کہ اگر کوئی شخص بغیر ساز کے

---

[1] ۔ ایضاً ، ص ۱۴۹ ۔ ۱۵۰ ۔

[2] ۔ ایضاً ، ص ۱۵۰ ۔

مجلس میں بیٹھے تو آسے باہر نکال دیں ۔ حضرت گیسو دراز رح فرماتے ہیں کہ قاضی حمید الدین رح نے مسکراتے ہوئے فرمایا کہ کوئی شخص بغیر ساز کے جنت میں داخل نہیں ہوگا[1] ۔

حضرت گیسو دراز رح فرماتے ہیں کہ ایک بار ایسا ہوا کہ ان کے والد بزرگوار اُس مسجد میں جس میں وہ پڑھنے جاتے تھے ایک گوشے میں نماز اشراق ادا کر رہے تھے۔ اتفاق سے ان کے استاد اور ایک طالب علم سماع کے موضوع پر بحث کرنے لگے ۔ جب ان کے والد نماز سے فارغ ہوئے تو فرمانے لگے کہ انھوں نے نماز کے دوران ان کی گفتگو سنی ہے اور اگر وہ چاہیں تو وہ آسے حرف بحرف دہرا سکتے ہیں ۔ لیکن جب وہ مجلس سماع میں شریک ہوتے ہیں تو سوائے مطلوب کے اور کوئی بات ان کے ذہن میں نہیں ہوتی اور کسی بات کا انھیں شعور نہیں ہوتا ۔ اس کے بعد انھوں نے فرمایا کہ ایسی سماع کو کون حرام کہہ سکتا ہے[2] ۔

حضرت گیسو دراز رح فرماتے ہیں کہ ایک بار سات صوفی ، جن میں آن کے والد بزرگوار بھی شامل تھے ، مولانا برہان الدین کے ہاں جمع ہوئے ۔ وہاں سات شعر پڑھے گئے اور ہر شعر سے صوفیوں میں ذوق و شوق پیدا ہوا اور وہ بیخود ہو کر رقص کرنے لگے[3] ۔

حضرت گیسو دراز رح فرماتے میں کہ ایک بار ایک بد عقیدہ شخص ایک بادشاہ سے ملا اور اس نے بادشاہ کو صوفیوں سے بد ظن کر دیا ۔ بادشاہ نے حکم صادر کیا کہ صوفیوں کو شہر سے نکال دیا جائے ۔ جب یہ فرمان صوفیوں تک پہنچا تو انھوں نے درخواست کی کہ انھیں تین دن کی مہلت دی جائے تاکہ وہ اپنے ہمسایوں اور ملنے والوں کو الوداع کہہ سکیں ۔ اس کے علاوہ انھوں نے بادشاہ سے یہ بھی درخواست کی کہ انھیں آخری بار مجلس سماع منعقد کرنے کی اجازت دے دے ، بعدازاں وہ شہر چھوڑ جائیں گے ۔

بادشاہ نے ان کی درخواست منظور کر لی اور اپنے محل کے سامنے ایک سائبان نصب کرکے صوفیوں کو وہاں سماع منعقد کرنے کی دعوت دی اور خود

---

[1] ایضاً ، ص ۱۵۳ ۔

[2] ایضاً ، ص ۱۵۳ ۔

[3] ایضاً ، ص ۱۵۳ ۔

ایک جھرو کے میں بیٹھ کر تماشا دیکھنے لگا ۔ اتفاق سے اس کا ایک خورد سال بیٹا بھی کھڑا یہ تماشا دیکھ رہا تھا کہ اچانک نیچے گر گیا اور اس کے جسم کے حصے زمین پر بکھر گئے ۔ بادشاہ کو بیٹے کی وفات کا بڑا رنج ہوا اور اس نے خیال کیا کہ یہ سب کچھ انھی بدبخت صوفیوں کی وجہ سے ہوا ہے ۔ وہ ابھی صوفیوں سے بدلہ لینے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ صوفیوں کو اس سانحہ کا علم ہوگیا ۔ انھوں نے بادشاہ کو پیغام بھیجا کہ اس بچے کی میت کو یہاں بھیج دے اور جب وہ سماع سے فارغ ہوں گے تو اس کا بچہ زندہ و سلامت اس کے حوالے کر دیں گے بعد میں جو اس کے جی میں آئے ان کے ساتھ کرے ۔ صوفیوں کی درخواست پر اس بچے کے اعضاء کو ایک دری میں لپیٹ کر مجلس سماع میں رکھ دیا اور صوفی حسب سابق سماع میں مشغول ہوگئے کچھ دیر بعد دری میں حرکت پیدا ہوئی تو صوفیوں نے حاضرین سے کہا کہ اسے کھولیں ۔ جب لوگوں نے دری کھولی تو وہ بچہ اٹھ کر بھاگ گیا ۔ جب بادشاہ نے یہ ماجرا دیکھا تو جھرو کے سے نیچے اتر آیا اور ان صوفیوں کی خاک پا اپنی ڈاڑھی میں ڈالنے لگا ۔ بعد ازاں اس نے ان صوفیوں سے اپنے سلوک کی معافی مانگی اور ان سے بے حد تعظیم و تکریم سے پیش آیا[1] ۔

ایک روز حضرت نظام الدین اولیاء کے مریدوں کا ذکر کرتے ہوئے حضرت گیسو درازؒ نے فرمایا کہ ان کے مرشد حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ اور حضرت برہان الدین غریبؒ میں بڑی دوستی تھی ۔ جب کبھی ان کے مرشد اودھ سے دہلی آتے مولانا برہان الدینؒ اپنے احباب کے ساتھ ان کا استقبال کرتے ۔ حضرت چراغ دہلیؒ تین روز تک حضرت نظام الدینؒ کی خانقاہ میں قیام کرتے بعد ازآں ان کی اجازت سے خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی زیارت اور احباب سے ملاقات کے لیے تشریف لے جاتے ۔ اگر مولانا برہان الدینؒ کے احباب میں سے کوئی سماع کی خواہش ظاہر کرتا تو وہ فرماتے کہ مولانا محمود اودھیؒ تشریف لائے ہوئے ہیں اس سے بہتر سماع کا اور کونسا وقت ہو سکتا ہے[2] ۔

---

[1] ایضاً ۔

[2] ایضاً ، ص ۲۳۹ ۔

حضرت گیسو درازؒ فرماتے ہیں کہ مولانا برہان الدین غریبؒ اور ان کے یاران طریقت جملہ مزامیر کے ساتھ سماع سنا کرتے تھے لیکن ان کے مرشد حضرت چراغ دہلی ایسا نہیں کرتے تھے لیکن اگر کوئی شخص گاتے بجاتے ہوئے ان کے دروازے پر آ جاتا تو اُسے منع بھی نہیں فرماتے تھے اور کچھ دیر بعد اُسے کوئی چیز بھی مرحمت فرماتے تھے[۱] ۔

حضرت گیسو درازؒ فرماتے ہیں کہ ایک بار ایسا ہوا کہ حضرت نظام الدین اولیاء اپنے حجرہ میں قیام فرما تھے کہ زیر دیوار ایک عورت نے پہلے سہیلہ پھر شبانہ گایا ۔ حضرت نظام الدینؒ بے حد خوش ہوئے اور انہوں نے اوپر سے ہی اپنا لحاف ، نہالی ، ایک کپڑا اور جو کچھ بھی ان کے ہاتھ میں آیا ، نیچے پھینک دیا[۲] ۔

حضرت گیسو درازؒ فرماتے ہیں کہ ابراہیم نامی چنگ نواز دہلی میں رہتا تھا ایک بار وہ بیمار ہوا تو دوا لینے کے لیے مولانا صدر الدین طبیب کی خدمت میں حاضر ہوا اور اتفاق سے وہ اپنا رباب بھی ساتھ لیتا گیا ۔ حسن اتفاق سے حضرت گیسو درازؒ اور مولانا علاء الدین بھی اسی مطب میں تشریف فرما تھے ۔ ابراہیم نے رباب کے تار کسے اور اُسے بجانے لگا ۔ جب ساز بجنے لگا تو اس نے گانا شروع کر دیا ۔ حضرت گیسو درازؒ فرماتے ہیں کہ اگرچہ اس فن کے بڑے بڑے استاد موجود ہیں لیکن چنگ نوازی میں کوئی بھی ابراہیم کی گرد پا کو نہیں پہنچ سکتا ۔ اتفاق سے اس مجلس میں مولانا صدر الدین کا کم سن بیٹا یوسف بھی موجود تھا ۔ ابراہیم کے ساز و آواز نے اس پر ایسا اثر کیا کہ وہ بیہوش ہوکر گر پڑا اور اُسے اٹھا کر مجلس سے باہر لے گئے ۔ جب تک حضرت گیسو درازؒ وہاں موجود رہے اس وقت تک وہ ہوش میں نہیں آیا تھا ۔ آپ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد آج تک ایسی چنگ نہیں سنی[۳] ۔

حضرت گیسو درازؒ فرماتے ہیں کہ ایک روز حضرت نظام الدین کو سماع سننے کی خواہش پیدا ہوئی تو انہوں نے پوچھا کہ کوئی ہے جو کوئی چیز سنائے ۔

---

۱ - ایضاً ، ص ۲۶۳ -

۲ - ایضاً ، ص ۲۶۴ -

۳ - ایضاً ، ص ۱۷۸ -

خواجہ اقبال اور بعض دوسرے خدام گانا جانتے تھے ۔ چنانچہ انھوں نے شیخ کے حضور میں گانا شروع کیا ۔ شیخ اس سماع سے لطف اندوز ہوئے اور انھوں نے خوش ہو کر انھیں کپڑے عطا کیے ۔ کچھ دیر بعد حسن میمندی وہاں آیا تو گانے والوں نے اسے بتایا کہ آج تم یہاں نہیں تھے ۔ انھوں نے شیخ کے سامنے گایا اور انھوں نے خوش ہو کر کپڑے عطا کیے ۔ انھوں نے حسن میمندی کو یہ بھی بتایا کہ اس کے گانے کا شیخ پر اتنا اثر ہوا کہ وہ رونے لگے ۔ ان کی باتیں سن کر میمندی نے کہا کہ شیخ کا گریہ تاثیرِ سماع کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ وہ اس بات پر رو رہے تھے کہ وہ کن لوگوں کے ہاتھ گرفتار ہوگئے اور انھیں ان سے کب رہائی ملے گی ؟ اتفاق سے حضرت نظام الدین اولیاء نے ان کی گفتگو سن لی اور انھوں نے حسن کو اپنے پاس بلا کر پوچھا کہ وہ کیا کہہ رہے تھے ؟ حسن میمندی نے پورا واقعہ حضرت کی خدمت میں عرض کیا تو شیخ نے مسکراتے ہوئے فرمایا :

”حسن تم ٹھیک کہتے ہو ، بات واقعی وہی تھی جو تم نے کہی ہے“ ۔

حضرت گیسو درازرح فرماتے ہیں کہ شیخ نصیر الدین چراغ دہلیرح بڑے عمر رسیدہ ہوگئے تھے تاہم جب مجلس سماع میں ان پر وجد طاری ہوتا تو وہ اس طرح چکر لگاتے ، رقص کرتے اور ہاتھ پاؤں مارتے تھے کہ کوئی نوجوان بھی اپنی پوری توانائی کے ساتھ[1] ایسا نہیں کر سکتا تھا ۔ ایک بار حضرت گیسو درازرح کے گھر میں مجلسِ سماع منعقد ہوئی تو حضرت چراغ دہلیرح بھی اس میں شریک ہوئے ۔

جب قوال نے یہ شعر پڑھا :

سگے دنبال آن محمل طفیل او دواں من ہم
سنش لبیک میگویم او سگ را ہمی خواند

تو حضرت چراغ دہلیرح اس تیزی سے مجلس سے اٹھ کر بھاگے کہ حاضرین میں سے کوئی بھی ان تک نہ پہنچ سکا ۔

حضرت گیسو درازرح فرماتے ہیں کہ حضرت چراغ دہلیرح ہندی راگ بہت کم سنتے تھے اور موصوف زیادہ تر فارسی کلام ہی پسند فرماتے تھے ۔

---

[1] ۔ ایضاً ، ص ۱۸۱ ۔

کئی بار ایسا بھی دیکھنے میں آیا کہ انھوں نے اپنی دستار اُتار کر مطرب کو دے دی۔ حضرت نظام الدین رح کے انتقال کے بعد ایک بار اُن کی خانقاہ میں مجلس سماع منعقد ہوئی تو جب قوال نے یہ مصرع پڑھا:

مجلس یار ہماں است ولی یار کجا

تو حضرت نے اپنے سر سے طاقیہ آتار کر زمین پر پھینک دی[1]۔

حضرت گیسو دراز رح فرماتے ہیں کہ مولانا برہان الدین غریب اور اُن کے یاران طریقت اکثر دف زنوں کو بلا لیتے اور ان سے گانا سنتے اور وجد میں آ کر رقص کرنے لگتے[2]۔

حضرت گیسو دراز رح کے ملفوظات سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ اس زمانے میں ایک اچھا قوال چھ جیتل سے زیادہ صلہ وصول نہ کرتا تھا اور حسن میمندی جو اپنے زمانے کا مشہور ترین قوال تھا، سولہ جیتل لے کر مجلس سماع میں شرکت پر آمادہ ہو جاتا تھا[3]۔

سماع میں اس قدر ذوق و شوق سے حصہ لینے، سماع کے ذریعے اپنی بیشتر روحانی منزلیں طے کرنے اور اپنے اکابر اور احباب کے مجالس سماع میں شرکت کرنے کے واقعات بیان کرنے کے بعد حضرت گیسو دراز رح اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ کامل را ذوق سماع نباشد[4]۔ سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء فرماتے ہیں کہ دین و دنیا کی کوئی نعمت ایسی نہ تھی جو خدا تعالیٰ نے حضرت ابوحفص شہاب الدین عمر سہروردی رح کو عطا نہ کی ہو، مگر انھیں ذوق سماع سے محروم رکھا تھا[5]۔

۱۔ ایضاً، ص ۳۰۶ - ۳۰۷۔
۲۔ ایضاً، ص ۲۶۴۔
۳۔ ایضاً، ص ۸۷۔
۴۔ ایضاً۔ ص ۱۱۵۔
۵۔ حسن سجزی، فوائد الفواد، مطبوعہ لاہور ۱۹۶۶ء، ص ۵۶۔
"ہر نعمتی کہ در بشر ممکن است شیخ شہاب الدین را دادند، الا ذوق سماع"۔

تاثیر سماع

حضرت گیسو درازؒ فرماتے ہیں کہ حضرت نظام الدین اولیاء کی خانقاہ میں جب باؤلی کھودی گئی تو وہاں سے کھاری پانی برآمد ہوا ۔ حضرت کے خادم خاص اقبال نے ان کی خدمت میں عرض کی کہ باؤلی سے بڑا کھاری پانی نکلا ہے اگر یہ پانی میٹھا ہوتا تو لوگ اس سے بڑا فائدہ اٹھاتے ۔ خواجہ اقبال کی بات سن کر حضرت نے فرمایا کہ انہیں کسی روز مجلس سماع میں یہ بات یاد دلائے ۔ چند روز بعد جب حضرت کی خانقاہ میں مجلس سماع منعقد ہوئی تو خواجہ اقبال نے انہیں وہ بات یاد دلائی تو حضرت نے قلم ، دوات اور کاغذ طلب فرمائے ۔ خواجہ اقبالؒ نے تینوں چیزیں حضرت کی خدمت میں پیش کیں تو حضرت نے ایک تعویذ لکھ کر اُسے دیا اور فرمایا کہ اُسے باؤلی میں ڈال دے ۔ حضرت گیسو درازؒ راوی ہیں کہ جونہی وہ تعویذ باؤلی میں ڈالا گیا ، اس کا پانی میٹھا ہو گیا[۱] ۔

وجد کو زمزمۂ مرغ سحر کافی ہے
شیفتہ ناز مغنیٔ مزا میر نہ کھینچ

(مصطفیٰ خاں شیفتہ)

---

۱ - جوامع الکلم ، ص ۲۸۲ -

حملۂ تیمور کے بعد موسیقی اور موسیقار

فیروز تغلق نے ۱۳۸۸ء میں انتقال کیا۔ اس کے آنکھیں بند کرتے ہی تغلق خاندان کا زوال شروع ہو گیا اور دس سال کے عرصے میں آٹھ سلطان دہلی کے تخت پر بیٹھے۔ ایسے حالات بیرونی حملہ آوروں کے لیے سازگار ہوتے ہیں۔ ۱۳۹۸ء میں وسطِ ایشیاء کے طاقتور حکمران امیر تیمور نے برعظیم پاک و ہند پر حملہ کیا۔ اس کی آمد کی اطلاع ملتے ہی دہلی سے بہت سے باکمال مشرق اور جنوبی ہند کی طرف نکل گئے۔ حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ کے جانشین حضرت بندہ نواز گیسودرازؒ نے دکن کی راہ لی اور گلبرگہ کو رشد و ہدایت کا مرکز بنایا۔ ملک العلماء شہاب الدین دولت آبادی نے جونپور میں سلطان ابراہیم شرقی کے دربار میں پناہ لی۔ اسی طرح دوسرے اہل کمال نے بھی صوبائی دارالحکومتوں کی راہ لی۔

سلطان ابراہیم شرقی (م ۱۴۴۰ء) اور اس کے جانشینوں کی دریا دلی اور علم دوستی نے جونپور کو صحیح معنوں میں "شیرازِ ہند" بنا دیا۔ سلطان ابراہیم کے پوتے سلطان حسین شرقی (م ۱۵۰۰ء) نے موسیقی میں بڑا نام پیدا کیا۔ موجودہ اصطلاح میں وہ کمپوزر (composer) تھا۔ "خیال" جیسا مقبول راگ اسی کی ایجاد ہے۔ اس کے علاوہ جونپوری ٹوڈی، جونپوری بسنت، جونپوری اساوری اور حسینی کا نہڑا بھی اسی کی ایجاد ہیں[1]۔ ماہرین فن نے اسے "نائک" کا لقب دے کر نائک بخشو کا ہم پلہ قرار دیا ہے۔ انگریزی زبان میں لکھی جانے والی تاریخوں میں اسے "The Musician King of Jaunpur" کے نام سے یاد کیا گیا ہے[2]۔

کشمیر کا سلطان زین العابدین بڈ شاہ (م ۱۴۷۲ء) بھی موسیقی کا سرپرست تھا۔

---

[1] ۔ اُردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ، لاہور: ۱۹۷۳ء، ج ۸، ص ۲۰۱۔

[2] ۔ ڈاکٹر عبدالحلیم، ایسیز آن ہسٹری آف انڈو پاک میوزک، ڈھاکہ: ۱۹۶۲ء ص ۱۲۔

مجددِ کشامرہ منشی محمد دین فوق رقمطراز ہے کہ زین العابدین کو ساز و سرود کے ساتھ بڑی رغبت تھی اور وہ اس فن کو خوب جانتا اور راگ کی ماہیت کو خوب سمجھتا تھا ۔ اس نے ملّا عود اور جمیل جیسے مغنیوں کو ، جو صاحبِ تصنیف اور کئی راگ راگنیوں کے موجد تھے ، خراسان سے کشمیر بلایا اور ان کی بڑی آؤ بھگت کی۔[1] اس کے ایک درباری بودی بٹ نے علمِ موسیقی پر "زین" کے عنوان سے ایک کتاب لکھ کر سلطان کی خدمت میں پیش کی۔[2] زین العابدین کے ذوق و شوق کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ گاہ گاہے کتبِ موسیقی اور موسیقاروں کا تبادلہ گوالیار کے حکمران راجہ مان سنگھ تنوار کے ساتھ کیا کرتا تھا۔[3] راجہ مان سنگھ تنوار کو اساتذۂ فن نے استاد تسلیم کیا ہے ۔ "دھرپد" اسی نے ایجاد کیا تھا۔[4] اس نے فنِ موسیقی پر "مانکتوہل" کے عنون سے ایک بلند پایہ کتاب تحریر کی تھی، جس پر مدتوں تک شمالی ہند کے گویوں کا دار و مدار رہا۔[5]

راجہ مان سنگھ کی رانی "مرگ نینی" بڑے اونچے پائے کی فنکارہ تھی - اسے گانے میں بڑا درک تھا ۔ مان سنگھ نے اس کے نام پر میوزک اکیڈمی قائم کی تھی ، جہاں سے بڑے نامی گرامی موسیقار تربیت پا کر نکلے - بخشو نائک ، جس کی بیٹی کے سامنے تان سین نے زانوئے تلمذ تہ کیا تھا ، اسی اکیڈمی کا تربیت یافتہ تھا ۔

---

۱ - محمد دین فوق ، تاریخ بڈ شاہی ، لاہور : ۱۹۴۴ء ، ص ۳۳۸ -

۲ - ایضاً ، ص ۳۴۰ -

۳ - ڈاکٹر عبدالحلیم ، ایسیز آن ہسٹری آف انڈ و پاک میوزک ، ڈھاکہ : ۱۹۶۲ء ، ص ۱۸ -

۴ - (i) عطیہ فیضی ، دی میوزک آف انڈیا ، لندن : ۱۹۲۵ء ، ص ۲۳ -
(ii) پروفیسر شری پدابندو پادھیائے ، دی میوزک آف انڈیا ، بمبئی تاریخ ندارد ، ص ۵۶ -

۵ - سیف خان ، راگ درپن ، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور ، ورق ۲ ب -

راجہ مان سنگھ کی قائم کردہ اکیڈیمی میں بچھو اور بھنور نامی دو "نادرہ کاران روزگار" جیسے موسیقار موجود تھے ۔ علامی ابو الفضل نے آئین اکبری میں ان کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا ہے ۔ ان دونوں نے حضرت محمد غوث گوالیاری کے کہنے پر میاں تان سین کو راگ ودیا کی تعلیم دی تھی[1]۔

اسی زمانے میں متھرا میں بابا ہری داس نام کے ایک نامور موسیقار رہتے تھے ۔ وہ گاہ گاہے گوالیار آتے تو حضرت محمد غوث سے ضرور ملتے تھے ۔ ان دونوں میں رشتۂ مؤدت استوار تھا ۔ مؤخر الذکر بزرگ نے میاں تان سین کو کچھ عرصے کے لیے ان کے پاس بھیجا اور انھوں نے تان سین کو موسیقی کے زیر و بم سے متعارف کرایا ۔

حضرت محمد غوث بابر کی آمد سے قبل گوالیار میں رہتے تھے ۔ وہ شطاری سلسلے کے نامور درویش تھے ۔ قاضی معراج دھولپوری ان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ سماع سے دلچسپی رکھتے تھے اور گانے کے نکات سے واقف تھے ، لیکن ان کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ خود موسیقاروں کی تربیت کرتے ، لیکن ان کی دعائیں راگ ودیا سیکھنے والوں کے ساتھ رہتی تھیں[2]۔

حملۂ تیمور کے بعد جب سلطنت دہلی کمزور پڑی تو دلاور خان غوری نے مالوہ میں ایک آزاد ریاست کی بنیاد رکھی ۔ جب اس کا پوتا محمد غزنی کمزور ہوا تو اس کے وزیر محمود خلجی نے تخت پر قبضہ کر لیا ۔ مالوہ کا آخری حکمران باز بہادر تھا ، جسے شکست دے کر اکبر نے مالوہ کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا ۔ باز بہادر بڑے اونچے پائے کا موسیقار تھا اور اس کا شمار اساتذۂ فن میں ہوتا ہے ۔ ابو الفضل جو کسی کو خاطر میں نہیں لاتا ، اس کے کمال کا معترف تھا ۔ اس نے گانے کی ایک خاص طرز

---

[1] ابوالفضل ، آئین اکبری ، مطبوعہ نولکشور پریس ۱۸۶۹ء ، ج ۳ ، ص ۱۸۱ ۔

[2] قاضی معراج دھولپوری ، ماہنامہ آجکل دہلی ، موسیقی نمبر ماہ اگست ۱۹۵۶ء ، ص ۹۰ ۔

اپنا لی تھی جو اس کے نام کی مناسبت سے "باز خانی" کہلاتی ہے[1]۔ اس کی محبوبہ روپ متی کی بھی موسیقی پر مکمل دسترس تھی ۔ باز بہادر اور روپ متی کے رومان کے قصے ہماری ادبی اور تاریخی کتابوں میں محفوظ ہیں ۔ صبح بنارس اور شام اودھ کی طرح شبِ مالوہ بھی ضرب المثل بن گئی ہے ۔ شبِ مالوہ کو مشہور کرنے میں باز بہادر اور روپ متی کا بڑا ہاتھ ہے ۔ وہ چاندنی راتوں میں مالوہ کی حسین وادیوں میں نغمے بکھیرا کرتے تھے ۔ مولانا امتیاز علی خان عرشی مرحوم لکھتے ہیں کہ باز بہادر کے عہد میں مالوہ فنِ موسیقی کا گھر بن گیا تھا[2]۔

مالوہ کی طرح گجرات بھی موسیقی کا بڑا مرکز تسلیم کیا جاتا تھا ۔ سلطان محمود بیگڑہ کے بیٹے سلطان مظفر گجراتی نے علمِ موسیقی میں بڑی مہارت حاصل کر لی تھی ۔ وہ بڑا خوش آواز تھا اور اسے ہر ساز بجانے پر قدرت تھی ۔ اس کے عہد کے موسیقار اس کی شاگردی پر فخر کرتے تھے ۔ اس نے اپنی دریا دلی اور فن کی قدردانی کی بنا پر گجرات کو موسیقی کا گہوارہ بنا دیا تھا ۔ اس نے ١٥٢٦ء میں ٥٦ برس کی عمر میں انتقال کیا[3]۔

سلطان مظفر کا بیٹا سلطان بہادر شاہ بھی موسیقی کی سرپرستی کرتا رہا ۔ نائک بخشو جیسا نادرِ روزگار موسیقاو اور میاں تان سین کا ہم پلہ نائک بیجو اس کے دربار سے وابستہ تھے ۔ سلطان مظفر کے پوتے سلطان محمود ثانی کا وزیر دریا خاں موسیقاروں کا مربی تھا ۔ اس کے دورِ وزارت (١٥٣٨ء ۔ ١٥٥٤ء) میں احمد آباد کے در و دیوار سے نغموں کی صدا آنے لگی ۔ اس کے دربار سے نائک ابھو، نائک حسینی ، رنگ خان ، ملھی اورکھیم ہرن جیسے اساتذۂ فن وابستہ تھے ۔ نائک حسینی نائک بخشو کا بیٹا تھا اور اپنے زمانے

---

[1] ۔ امتیاز علی خاں عرشی، ماہنامہ آجکل دہلی، موسیقی نمبر ماہ اگست ١٩٥٦ء، ص ١٠٥ ۔

[2] ۔ ایضاً ، ص ١٠٣ ۔

[3] ۔ ایضاً ۔

کا بہت بڑا گویا مانا جاتا تھا ۔ رنگ خان اور ملھی ، نائک چتر کے فرزند اور اپنے والد کی عظیم روایات کے حامل تھے ۔ گھیم ہرمن بھی بلا کا گویا تھا ۔ نائک بخشو نے توڑی میں دیسکار کو داخل کر کے سلطان بہادر شاہ کے نام پر بہادری توڑی نام رکھا ۔ اس کے فرزند یہ نغمہ بہادر شاہ کے دربار میں پیش کیا کرتے تھے[1] ۔

دکن میں کرناٹک ہمیشہ موسیقی کا گہوارہ بنا رہا ، لیکن وہاں جتنا کام اس فن پر ہوا وہ سنسکرت یا مقامی زبانوں میں ہوا ، جس کے بارے میں ہماری معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں ۔

ساز ہستی کا جائزہ کیسا   تار کیا ، دیکھ تار کی آواز
(اصغر گونڈوی)

---

[1] ایضاً ۔

سلطان سکندر لودھی کا ذوق موسیقی

شعر العجم میں شبلی نعمانی ملک الشعرا طالب آملی کا ذکر کرتے ہوئے جہانگیر کے متعلق لکھتے ہیں :

سلسلۂ تیموریہ میں یوں تو ہر فرمان روا سخن فہم و ادا شناس گزرا ہے ، لیکن جہانگیر اس فن میں اجتہاد کا درجہ رکھتا تھا[1]"۔ بالکل یہی بات لودھی خاندان کے فرمان روا سلطان سکندر پر راس آتی ہے ۔ مؤرخِ شہیر نعمت اللہ ہروی اپنی مشہور تصنیف تاریخ خان جہانی میں اس کے متعلق رقمطراز ہے :

سلطان در شعر فارسی سلیقہ تمام داشت و شعر خوب می گفت و گلرخی تخلص می کرد - و ہر روز چند ساعت معین بود کہ باہل فضل و فصاحت و اہلِ شعر مجلس می داشت و مباحثہ شعر درمیان بود[2]۔

ترجمہ : فارسی شاعری میں سلطان بڑی دسترس رکھتا تھا اور اچھے شعر کہتا تھا - وہ گلرخی تخلص کرتا تھا - ہر روز کچھ وقت مخصوص تھا ، جس میں وہ عالموں ، خوش بیان مقرروں اور شاعروں کے ساتھ مجلس آراستہ کرتا تھا - وہاں عموماً شعر و شاعری پر گفتگو ہوا کرتی تھی -

اکبری عہد کے مشہور مؤرخ ملا عبدالقادر بدایونی کی ایک تحریر سے بھی نعمت اللہ ہروی کے مندرجہ بالا بیان کی تائید ہوتی ہے - منتخب التواری میں سکندر لودھی کا ذکر کرتے ہوئے بدایونی رقمطراز ہے :

---

[1] - شعرالعجم ، جلد سوم ، ظفر بکڈپو ، لاہور ، ص ۱۳۳ -

[2] - تاریخ خان جہانی ، جلد اول ، مطبوعہ ڈھاکہ ۱۹۶۰ء ، ص ۱۸۹ -

سلطان سکندر لودھی با شاعران نشست و برخاست بسیار داشت و خود ہم صاحبِ طبع بود و گاہ گاہی نظمی بہ تخلص گلرخ بآن روش قدیم ہندوستانیان میگفت و صحبتِ اوبشیخ جمالی ازیں رہگذر خوش برآمدہ بود[1]۔

ترجمہ : سلطان سکندر شاعروں کے ساتھ بہت نشست و برخاست رکھتا تھا خود بھی موزوں طبیعت رکھتا تھا ۔ کبھی کبھار وہ گلرخ کے تخلص سے ہندوستانیوں کی قدیم روش کے مطابق نظم بھی کہہ لیتا تھا ۔ اس ضمن میں شیخ جمالی کے ساتھ اس کی گاڑھی چھنتی تھی ۔

سکندر لودھی بڑا متقی و پرہیزگار بادشاہ ہو گزرا ہے ۔ اس کی انتظامی قابلیت ، بیدار مغزی اور علم دوستی کی تقریباً سبھی مؤرخوں نے تعریف کی ہے ۔ تاریخ شاہی کا مصنف احمد یادگار سلطان کے اخلاق و اطوار کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے :

سلطان سکندر پادشاہے بود و بکمال تقویٰ و دیانت آراستہ و بعلم و فضل پیراستہ ، اکثر بعلما و فضلا صحبت داشت در عہدِ او اسلام را رونقی تمام بودہ کافران مجال نہ داشتند کہ بت پرستی نمایند و یا آب غسل توانند کرد ۔ اصنام رادر عہد میمون او در زیر خاک داشتہ بودند و سنگ نگر کوٹ کہ عالمی را آوراہ ساختہ ، آوردہ بقصاباں دادہ بود کہ وزن گوشت بکنند ۔ و اکثر اوقات بشعر گفتن و خواندن گذاشتی[2]۔

ترجمہ : سلطان سکندر ایسا بادشاہ تھا جو تقویٰ و دینداری سے آراستہ اور صاحبِ علم و فضل تھا ۔ وہ اپنا بیشتر وقت عالموں اور فاضلوں کی صحبت میں گذارتا تھا ۔ اس کے عہد میں اسلام میں بڑی رونق پیدا ہو گئی تھی اور کافروں کی یہ مجال نہ تھی کہ وہ بت پوجیں یا دریا میں اشنان کریں ۔ اس کے مبارک عہد میں

---

[1] ۔ منتخب التواریخ ، جلد اول ، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۸ء ، ص ۳۲۳ ۔

[2] ۔ تاریخ شاہی مطبوعہ کلکتہ ۱۹۳۹ء ، ص ۴۵ ۔ ۴۶ ۔

> بتوں کو زمین میں چھپا کر رکھتے تھے۔ اس نے نگر کوٹ کا بت جس نے ایک عالم کو گمراہ کر دیا تھا ، قصابوں کے حوالے کیا تا کہ اس کے برابر گوشت تولا کریں ۔ اس کا بیشتر وقت شعر کہنے اور سننے میں صرف ہوتا تھا ۔

سلطان سکندر کو شعر و شاعری کے علاوہ موسیقی سے بھی بڑا لگاؤ تھا اور وہ ہر شب مجلسِ سرود منعقد کیا کرتا تھا ۔ احمد یادگار رقمطراز ہے کہ سلطان موسیقاروں کا بڑا سرپرست تھا اور اس کی قدر دانی خوش الحان گویوں کو ملک کے طول و عرض سے دارالحکومت کھینچ لائی تھی ۔ سلطان کے حکم سے ایک گھڑی رات گزرے گویے اور سازندے اپنے اپنے فن کا مظاہرہ شروع کرتے ۔ رات کی ان مخصوص مجالس میں عموماً سلطان کے چار غلام ، جنھیں اس نے چھ ہزار دینار کے عوض خریدا تھا ، مجلس کی جان سمجھے جاتے تھے ۔ ان میں سے ایک چنگ بجانے میں دوسرا قانون نوازی میں ، تیسرا طنبورا بجانے میں اور چوتھا بین کاری میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ ان کی آواز بھی اتنی دلکش تھی کہ بقول مصنف اس سے مردہ تنوں میں جان پڑ جاتی تھی اور زندوں کی جان نکل جاتی تھی ۔ احمد یادگار لکھتا ہے کہ اڑتے ہوئے پرندے ان کی آواز سن کر زمین پر اتر آتے تھے اور زہرہ سیارہ فضا میں معلق ہو کر رہ جاتا تھا ۔ صانع قدرت نے ان کو حسنِ صوت کے ساتھ حسن صورت بھی عطا کیا تھا ۔ ان کی آواز سن کر اور شکل دیکھ کر حاضرینِ مجلس بن پئے مدہوش ہو جاتے تھے اور شراب صراحیوں میں یوں ہی پڑی رہ جاتی تھی ۔ نصف شب گزرنے پر جب یہ مجلس ختم ہونے پر آتی تھی تو سلطان کے حکم سے چار سرنا نواز اپنے فن کا مظاہرہ کرتے اور لے ہی لے میں کبدارہ ، اڑانہ ، حسی اور رام کلی پیش کرتے تھے[1]۔

تاریخ داؤدی کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مجالسِ سرود میں سلطان شاہی آداب کا خاص خیال رکھتا تھا ۔ اگر کبھی کوئی اجنبی گویا سلطان کی خدمت میں اپنا راگ پیش کرنا چاہتا تو وہ میراں سید روح اللہ اور

---

[1] ۔ تاریخ شاہی ، مطبوعہ کلکتہ ، ۱۹۳۹ء ، ص ۴۸ ۔

سید ابنِ رسول کو بلا کر اس سے راگ سننے کا حکم دیتا اور خود پردے کے پیچھے بیٹھ کر راگ ملاحظہ کرتا[1]۔ عبداللہ ہی کی روایت ہے کہ سلطان سکندر کو سازوں میں شہنائی بے حد مرغوب تھی اور راگوں میں صرف مالکوس ، کلیان ، کانہڑا اور حسینی سننا پسندکرتا تھا ۔ اگر کوئی گویا ان کے علاوہ کوئی اور راگ چھیڑنے کی جرأت کر بیٹھتا تو وہ سزا کا مستوجب ہوتا تھا[2]۔

سلطان کا موسیقی میں لگاؤ دیکھ کر عوام بھی اس فنِ لطیف میں دلچسپی لینے لگے ۔ مولانا شبلی نے کیا خوب کہا ہے کہ ایشیائی سلطنتوں کا عام قاعدہ ہے کہ بادشاہ کا مذاق تمام ملک میں سرایت کر جاتا ہے اور تمام لوگوں میں وہی خصائل پیدا ہو جاتے ہیں جو بادشاہ میں پائے جاتے ہیں[3]۔

شیخ جمالی اس عہد کے فضلا اور شعرأ میں سر برآوردہ تھے اور بادشاہ ان سے اپنے کلام میں اصلاح بھی لیا کرتا تھا ۔ شیخ موصوف بھی موسیقی کے بڑے دلدادہ تھے ۔ ان کی ایک غزل کے یہ اشعار بڑے مشہور ہیں :

طال شوق الی منازلکم
ایہا الغائبون عن نظری

روز شب مونسم خیال شماست
فاسئلوا عن خیالکم خبری

انہوں نے اس غزل کی لے بھی خود ہی مرتب کی تھی ۔ بدایونی کا بیان ہے کہ اسے سن کر اہلِ دل پر وجد کی کیفیت طاری ہو جایا کرتی تھی[4]۔ اکبر کے عہد میں بھی اس غزل کی مقبولیت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا اور یہ برابر صوفیوں کی مجالس میں گائی جاتی تھی ۔

---

[1] تاریخ داؤدی ، مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۵۴ء ، ص ۳۹ - ۳۸ -
[2] ایضاً : ص ۳۹ -
[3] مقالات شبلی ، جلد ۴ ، مطبوعہ اعظم گڑھ ۱۹۵۶ء ، ص ۱۰۶ -
[4] منتخب التواریخ ، جلد اول ، مطبوعہ کلکتہ ۱۹۶۸ء ، ص ۳۲۵ -

شیخ جمالی کے فرزند شیخ گدائی بیرم خان کے دورِ اقتدار میں صدر الصدور کے منصب پر فائز ہوئے تھے۔ ان کے متعلق شاہنواز خان رقمطراز ہے :

شیخ گدائی نیز طبع لطیف داشت و اکتساب کمالات و استفادہ علومِ رسمی نمود نقش صوت ہندی را خود می بست و می خواند[1]۔

> ترجمہ : شیخ گدائی نے موزوں طبیعت پائی تھی اور علوم و کمالات سے بہرہ ور تھے۔ ہندی گیتوں کی دھن خود مرتب کرتے اور گاتے تھے۔

سکندر لودھی کے ایک امیر قطب خان کو بھی موسیقی سے بڑی رغبت تھی اور اس کے ہاں اکثر مجالس سرود منعقد ہوتی رہتی تھیں۔ احمد یادگار نے اس کی مجلس کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے :

قطب خان دوسہ پیالہ شراب ناب خوردہ و نشۂ شراب او را بدماغ رسید سرودی آغاز شد کہ ساکنانِ عالمِ علوی در سماع آمدند و زہرہ بر آسمان معلق می زد[2]۔

> ترجمہ : قطب خان خالص شراب کے دو تین پیالے نوش کرتا۔ جب شراب کا نشہ اس کے دماغ کو متاثر کرتا تو سرود کا آغاز ہوتا اور عالم بالا کے ساکنان وجد میں آ جاتے ، اور زہرہ سیارہ فضا میں معلق ہو کر رہ جاتا۔

سلطان سکندر کا وزیر میاں بھوہ اپنے زمانے کا بہترین عالم مانا جاتا تھا ، وہ موسیقی کا دلدادہ اور موسیقاروں کا سرپرست تھا۔ ڈاکٹر عبدالحلیم کا خیال ہے کہ وہ خود بھی بڑا اچھا گا لیتا تھا[3]۔

۱۔ مآثر الامراء جلد ۲ ، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۹۰ء ، ص ۵۴۰۔

۲۔ تاریخ شاہی ، مطبوعہ کلکتہ ۱۹۳۹ء ، ص ۱۲۔

۳۔ ایسیز آن ہسٹری آف انڈو پاک میوزک ، مطبوعہ ڈھاکہ ۱۹۶۲ء ، ص ۱۹

سکندر لودھی کے عہد میں عمر سما یحییٰ الکابلی المعروف بہ صہاد نے فنِ موسیقی پر لہجات سکندر شاہی کے نام سے ۴۱۰ صفحات کی ایک ضخیم کتاب تصنیف کی تھی۔ اس کتاب کا واحد قلمی نسخہ لکھنؤ یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے[1]۔ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب سابق صدر شعبۂ فارسی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے حیدرآباد دکن سے شائع ہونے والے سہ ماہی انگریزی مجلہ اسلامک کلچر میں اس کتاب کا تفصیلی تعارف کروا دیا ہے[2]۔ ان کے خیال میں یہ ہندوستانی موسیقی پر پہلی کتاب ہے، جو برعظیم پاک و ہند میں لکھی گئی ہے۔

راقم الحروف نے مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں اس نادر مخطوطہ کے روٹو گراف سے استفادہ کیا ہے اور اس سلسلے میں ڈاکٹر نور الحسن صاحب اور پرفیسر عرفان حبیب صاحب کا تہ دل سے ممنون ہوں۔

اس کتاب کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے:

"شکر و سپاس بے قیاس پروردگاری را کہ گردن جامہ جان بطوق تعلق لحن و غنا بیاراست و اصواتِ مختلف۔۔۔"

فاضل مصنف کا نام کتاب کے دسویں صفحے پر اس طرح آیا ہے۔ "عمر سماؔ یحییٰ الکابلی۔ وہ عام طور پر صہاد کے نام سے مشہور تھا۔ کالی پرشاد، ڈاکٹر عبدالحلیم اور راقم الحروف نے اس کا عرف صہاد پڑھا ہے، جب کہ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب اسے حہاد پڑھتے ہیں۔

فاضل مصنف نے اس کتاب کو سلطان سکندر کے نام معنون کیا تھا، چنانچہ چھٹے صفحے پر سلطان کا نام اس طرح آیا ہے:

ابوالفتح سکندر شاہ بن ابوالمجاہد بہلول شاہ۔

اسی طرح کتاب کا نام "لہجات سکندر شاہی" بھی دسویں صفحے پر مرقوم ہے۔ جہاں تک کتاب کے مندرجات کا تعلق ہے یہ ایک خالص تکنیکی

---

[1] - کالی پرشاد، کیٹلاگ آف دی اورینٹل مینو سکرپٹس ان دی لکھنؤ یونیورسٹی لائبریری، مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۵۱ء - مخطوطہ نمبر ۷۸۰، ایس ۱۲۶ ایل -

[2] - اسلامک کلچر، حیدر آباد ۱۹۵۴ء، جلد ۲۸، ص ۴۱۴ -

چیز ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستانی موسیقی پر یہ ایک بہترین کتاب ہے۔ فاضل مصنف نے، جو خود بھی ماہر موسیقار معلوم ہوتا ہے، تمام راگوں اور راگنیوں کی تفصیل اس کتاب میں دی ہے اور اکثر مقامات پر مختلف راگوں کے سروں کو یوں واضح کیا ہے:

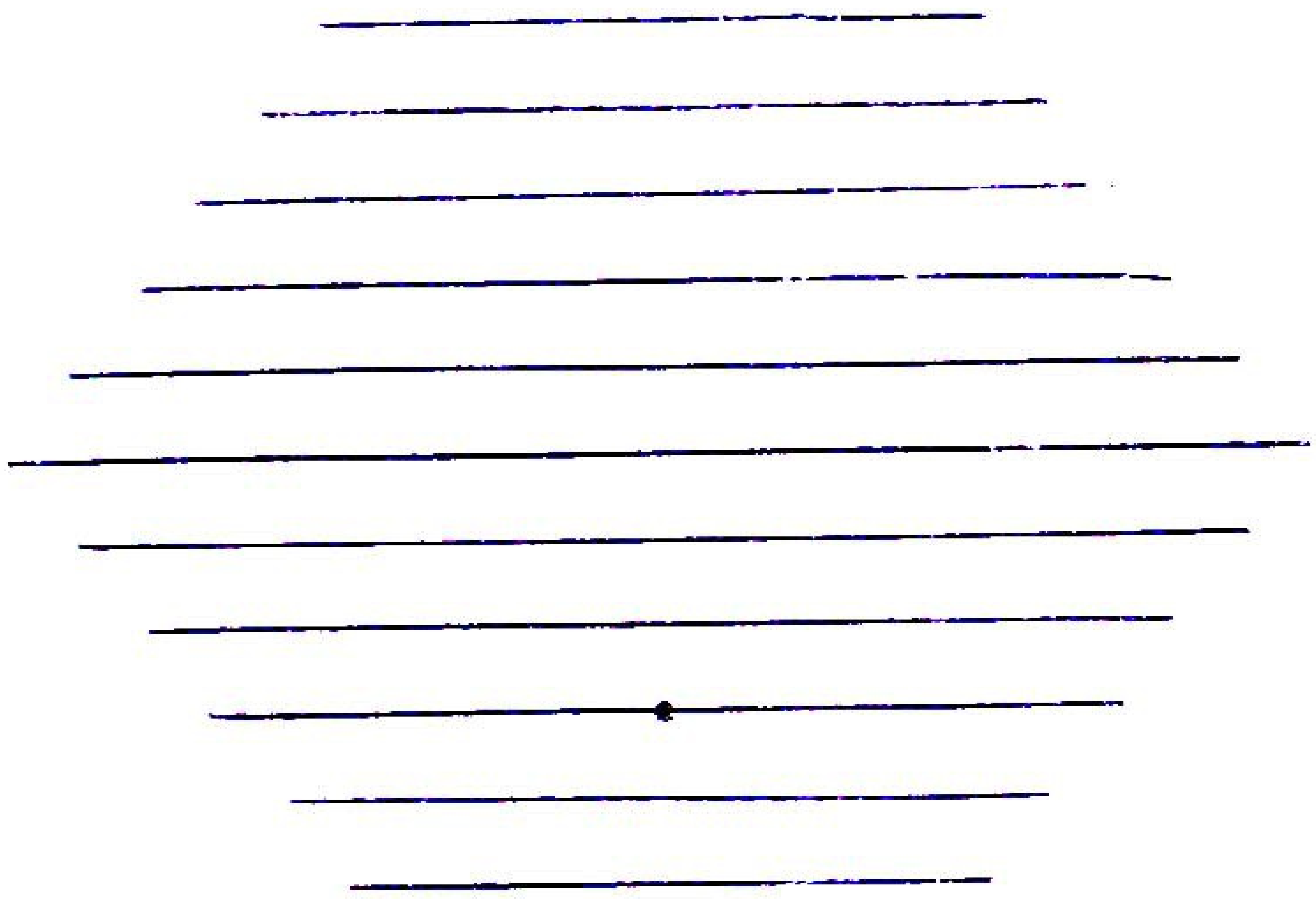

اس کتاب میں معمہ نما عبارات عام پائی جاتی ہیں۔ جن میں مختلف راگوں کے سروں کی تفصیلات درج ہیں۔ مثال کے طور پر اڑتالیسویں صفحے پر فاضل مصنف نے—سورجھنا کھرج کرام—گانے کی ترکیب یوں بتائی ہے:

م	ب	دہ	ن	س	ر	ک
ب	دہ	ن	س	ر	ک	م
دہ	ن	س	ر	ک	م	ب
ن	س	ر	ک	م	ب	دہ
س	ر	ک	م	ب	دہ	ن
ر	ک	م	ب	دہ	ن	س
ک	م	ب	دہ	ن	س	ر

اسی طرح دوسرے راگوں اور راگنیوں کے گانے کی تراکیب اور اوقات پر بھی مصنف نے سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس کے علاوہ اس کتاب میں جملہ آلات موسیقی کا بھی ذکر ملتا ہے۔ یہ کتاب چونکہ خالصتاً تکنیکی ہے۔ اس لیے میں اس سے کما حقہ استفادہ نہیں کر سکا۔

ساقی بجلوہ دشمن ایمان آگہی
مطرب بہ نغمہ رہزن تمکین و ہوش ہے

(غالب)

عہدِ بابر میں موسیقی اور موسیقار

برعظیم پاک و ہند میں مغلیہ سلطنت کا بانی ظہیرالدین محمد بابر شراب اور راگ و رنگ کا بڑا دلدادہ تھا۔ یوں بھی ان دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عمر خیام نے کیا خوب کہا ہے :

مے برکف من نہ و برآور غلغل
با نالۂ عندلیب و صوتِ بلبل
نے نغمہ اگر روا بدے مے خوردن
مے در شیشہ ہا نہ کردے قلقل[1]

لا جام شراب دے لبالب بالکل
کس وقت مگر ، جب ہوں چہکتے بلبل
بے نغمہ اگر شراب ہوتی جائز
سنتے نہ کبھی شیشے کے منہ سے قلقل[2]

برعظیم پاک و ہند کی فتح سے قبل اس کی عمر جس علاقے میں گذری اس کی فضا میں چاروں طرف میر علی شیر نوائی ، مولانا بنائی ، علی شیر بیگ اور عبید اللہ خان ازبک کے نغمے گونج رہے تھے۔ میر علی شیر نوائی ماہر

---

[1] ۔ عمر خیام ، رباعیات ، مطبوعہ نولکشور لکھنؤ ، ۱۹۳۹ء ، ص ٦٦ ۔

[2] ۔ آغا شاعر قزلباش ، خمکدۂ خیام ، مطبوعہ رفاہ عام پریس ، لاہور ، ص ۱۹ ۔

ارغون نواز تھا اور وہ موسیقاروں کا بڑا خیال رکھتا تھا[1] ۔ اس کے متعلق عباس پرویز لکھتے ہیں :

> چون خود موسیقی می دانست بتربیت طبقۂ آہنگسازان و موسیقیدانان می پرداخت[2] ۔

ترجمہ : وہ چونکہ خود موسیقی دان تھا اس لیے وہ سازندوں اور گویوں
کا بڑا خیال رکھتا تھا ۔

مولانا کمال الدین بنائی (م ۱۵۱۲ء) سلطان ابو الغازی حسین بایقرا (م ۱۵۰۶ء) کے عہد حکومت میں ہرات میں رہتے تھے ۔ بعد ازاں وہ وسط ایشیاء کے حکمران شیبانی خان ازبک (م ۱۵۱۰ء) کے دربار سے منسلک ہو گئے ۔ خان موصوف نے انھیں ملک الشعراء کے منصب جلیلہ پر فائز کیا ۔ شیبانی خان کے ساتھ دشمنی کی بنا پر بابر نے اسے ظالم ، جاہل اور اجڈ مشہور کر دیا ہے لیکن درحقیقت وہ بڑا پڑھا لکھا اور علم دوست حکمران تھا ۔ اس نے مرو میں ایک مدرسہ تعمیر کروایا تھا اور اس کے صحن میں اپنا قبرہ بھی بنوا لیا تھا لیکن شومئی قسمت سے اسے وہاں دفن ہونا نصیب نہ ہوا ۔ وہ نماز فجر کے بعد طالب علموں کو باقاعدہ درس دیا کرتا تھا ۔ مدرسے سے فارغ ہو کر وہ دربار لگاتا اور کاروبار حکومت کی طرف توجہ دیتا تھا ۔ وہ شاعر بھی تھا اور موسیقی کا قدر دان بھی ۔ مہمان نامۂ بخارا میں مولانا فضل اللہ بن روز بہان اصفہانی؟ نے اس کے چند اشعار بھی نقل کیے ہیں جن میں خان موصوف نے مولانا کا ذکر بھی کیا ہے[3] ۔

بابر مولانا کمال الدین بنائی کے بارے میں رقمطراز ہے کہ وہ محض شاعر تھے اور موسیقی کے ساتھ انھیں کوئی دلچسپی نہ تھی ۔ اسی بنا پر ان کا حریف شیر علی بیگ انھیں طعنے دیا کرتا تھا ۔ روز روز کی لعن طعن سن کر مولانا

---

[1] ۔ دولت شاہ سمرقندی ، تذکرہ ، مطبوعہ تہران ۱۳۳۰ش ، ص ۵۶۹ ۔

[2] ۔ عباس پرویز ، مقدمہ روضۃ الصفاء مؤلفہ میر خواند ، مطبوعہ تہران ۱۳۳۸ش ، ج ۱ ، ص "ط" ۔

[3] ۔ فضل اللہ بن روز بہان ، مہمان نامۂ بخارا ، تہران ، ۱۹۶۲ء ، ص ۱۹۰ ۔

بنائی نے موسیقی سیکھنے کا ارادہ کر لیا اور جلد ہی اس فن میں کمال حاصل کر لیا ۔ ایک روز انھوں نے شیر علی بیگ کی موجودگی میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا تو وہ دنگ رہ گیا[1] ۔ میر خواند لکھتا ہے کہ مولانا بنائی علم تصوف کے ماہر ، باکمال شاعر اور ایک اچھے موسیقار تھے ۔ اس کے الفاظ یہ ہیں :

از علمِ تصوف و موسیقی وقوف کامل داشت[2] ۔

ترجمہ : وہ علم تصوف اور موسیقی میں پوری دسترس رکھتے تھے

افسوس کہ ایسا باکمال شاعر نجم ثانی اور بابر کے ہاتھوں قرشی (سابقہ نسف اور نخشب) کے قتل عام میں مارا گیا[3] ۔

بابر لکھتا ہے کہ جب مولانا بنائی نے موسیقی میں مہارت حاصل کر لی تو علی شیر بیگ، جو سلطان ابو الغازی حسین بایقرا جیسے علم دوست حکمران کے دربار میں رہ چکا تھا ، ہرات کی سکونت ترک کر کے عراق چلا گیا ۔ عراق میں اس کا کام نہ بنا تو وہ آذر بائیجان چلا گیا جہاں سلطان یعقوب آق قویونلو (م ۱۴۹۰ء) نے اس کی عزت افزائی کی اور اسے اپنے ہاں ملازم رکھ لیا ۔ سلطان یعقوب کی وفات کے بعد وہ دوبارہ ہرات چلا آیا ۔ سلطان ابو الغازی حسین نے اُسے اپنا ندیم بنایا لیکن وہ اپنی شوخیٔ طبع اور یاوہ گوئی کی بنا پر زیادہ دیر تک ہرات میں نہ ٹھہر سکا[4] ۔ آخری عمر میں وہ قرشی میں جا بسا اور وہیں نجم ثانی اور بابر کے ہاتھوں قتل عام میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا ۔ بابر نے اُسے ایک اچھا راگی تسلیم کیا ہے ۔ بقول بابر اس نے کئی راگ ایجاد کیے تھے[5] ۔

---

۱ ۔ بابر ، تزک بابری ، (اردو ترجمہ) ، لاہور ، ۱۹۶۶ء ، ص ۱۰۸ ۔

۲ ۔ میر خواند ، روضۃ الصفاء ، تہران ، ۱۳۳۹ش ، ج ۷ ، ص ۳۸۱ ۔

۳ ۔ ایتھے اور زخاؤ ، فہرست مخطوطات فارسیہ بوڈلین لائبریری آکسفورڈ ، ص ۶۴۱ ۔

۴ ۔ بابر ، تزک بابری ، ص ۱۰۸ ۔

۵ ۔ ایضاً ، ص ۱۰۹ ۔

ماوراء النہر میں بابر کے حریف عبیداللہ خان ازبک (م ۱۵۳۹ء) کو فن موسیقی میں کمال حاصل تھا ۔ اس کی مرتب کردہ دھنیں عوام میں بہت مقبول ہوئیں ۔ مرزا حیدر دوغلات لکھتا ہے کہ وسط ایشیاء کے شہروں اور قصبوں میں عوام خان موصوف کے ترتیب دیے ہوئے نغمے الاپتے پھرتے ہیں ۔

بابر نے اپنی تزک میں ہرات میں غلام شادی ، حافظ حاجی ، جلال الدین محمود ، قل محمد عودی اور شیخ نائی (نائی = نے نواز) جیسے موسیقاروں کا ذکر کیا ہے ۔ یہ ممکن ہی نہ تھا کہ ایسے ماحول میں رہتے ہوئے بابر کو موسیقی کے ساتھ دلچسپی پیدا نہ ہو ۔ تزک کے بعض اندراجات سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ وہ موسیقی کے زیر و بم سے کماحقہ‘ واقف تھا ۔

کابل میں قیام کے زمانے میں بابر وہاں کے باغوں میں کبھی کبھی اپنے مصاحبوں کے ساتھ بیٹھ کر ناؤ نوش کی محفلیں سجاتا تو اس وقت موسیقار اس کی محفل کی رونق دوبالا کرنے کے لیے موجود ہوا کرتے تھے ۔

برعظیم پاک و ہند میں سلطنت مغلیہ کے قیام کے بعد اس نے آگرے اور گوالیار کے درمیان دھولپور میں ایک باغ لگوایا جس کا نام اس نے نیلوفر تجویز کیا[۲] ۔ وہ کبھی کبھی وہاں جا کر قیام کرتا اور چنگ و رباب کی تانوں سے لطف اندوز ہوتا ۔ گوالیار سے چھ کوس کے فاصلے پر اس نے ایک آبشار کے قریب بیٹھ کر معجون فلک سیر (ایک خاص قسم کی افیون) کھائی اور سازندوں اور گویوں سے راگ سنے[۳] ۔

بابر نے گوالیار کا دورہ کیا تھا ۔ یہ شہر موسیقی کا بہت بڑا مرکز مانا جاتا تھا ۔ بابر کے حضرت محمد غوث گوالیاری کے ساتھ بڑے نیازمندانہ تعلقات

---

۱ - مرزا حیدر دوغلات ، تاریخ رشیدی ، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری، آذر کلکشن نمبر ۹۵ ، ورق ۲۲۸ الف ۔

۲ - بابر ، تزک بابری ص ۲۵۳ ۔

۳ - ایضاً ، ص ۲۵۸ ۔

تھے ۔ اس کے بعد ہمایوں اور پھر اکبر نے بھی ان کے ساتھ تعلقات قائم رکھے۔ بابر ان کی سفارش رد نہ کرتا تھا[1] ۔ حضرت محمد غوث گوالیاری کو موسیقی کے ساتھ خاص لگاؤ تھا۔ یہ محض اتفاق نہیں کہ برعظیم پاک و ہند کے نامور موسیقار میاں تان سین نے ان کے سایۂ عاطفت میں تعلیم و تربیت حاصل کی تھی اور اور وہ مرنے کے بعد ان کی درگاہ کے احاطے میں دفن ہوا[2] ۔

بابر نے آگرے میں ایک باغ لگوایا اور اس کا نام چار باغ رکھا ۔ اس باغ میں وہ جشن منعقد کیا کرتا تھا[3] ۔ ایسے موقعوں پر موسیقاروں اور سازندوں کا موجود ہونا ضروری تھا ۔ ایک موقع پر اس نے اپنی تزک میں اپنے ندیموں کے ساتھ شام منانے کا ذکر کیا ہے ۔ ایسی دلکش شام میں ناؤ نوش اور موسیقی کا چولی دامن کا ساتھ ہے[4] ۔

بابر کو برعظیم میں چار سال سے زائد عرصہ رہنے کا موقع نہ ملا ۔ تاہم اس مختصر سے عرصے میں وہ یہاں وسط ایشیاء کی موسیقی متعارف کرا گیا ۔

* * *

اُس سانولی مطربہ کی اللہ ری شان
چھرے کے نمک میں گھل رہی ہے ہر تان
یوں نغمہ دمک اٹھتا ہے اس کے رخ پر
سونے کا ہو جس طرح سے کسوٹی پہ نشان
(جوش ملیح آبادی)

---

[1] ۔ ایضاً ، ص ۲۸۹ ۔

[2] ۔ قاضی معراج دھولپوری ، ماہنامہ آجکل دہلی موسیقی نمبر ، بابت اگست ۱۹۵۶ء ، ص ۹۵ ۔
(راقم دو بار حضرت محمد غوث گوالیاری کی درگاہ کے احاطے میں میاں تان سین اور ان کے فرزند بلاس خان کے مزارات پر حاضری دے چکا ہے ۔ اب بھی گوالیار کے موسیقار ان کے مزار سے قریب بیٹھ کر وہاں گھنٹوں ریاض کرتے ہیں) ۔

[3] ۔ بابر ، تزک بابری ، ص ۲۶۶ ۔

[4] ۔ ایضاً ، ص ۲۶۶ ۔

ہمایوں کا ذوقِ موسیقی

تاریخ کی ورق گردانی سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمایوں موروثی خصوصیتوں سے بہرہ اندوز ہوا تھا۔ مورخین کا خیال ہے کہ اگر وہ ہندوستان کے تخت پر بیٹھنے کی بجائے کسی مدرسے کی مسندِ علم کو زینت بخشتا تو بڑا کامیاب اُستاد ثابت ہوتا۔ ہمایوں کے دل میں علمی ذوق ہر وقت موجزن رہتا تھا اور اسے کتابوں کے ساتھ اتنی محبت تھی کہ سفر کے عالم میں بھی اُسے ان کی جدائی گوارا نہ تھی۔ اس کے لائبریرین کا کہنا ہے کہ وہ لمحہ بھر کے لیے بھی ادھر اُدھر نہیں ہو سکتا تھا کہ خدا جانے بادشاہ کس وقت کون سی کتاب طلب کر لے۔ اس علمی ذوق کے ساتھ قدرت نے اُسے موسیقی کا ذوق بھی ودیعت کیا تھا۔

ہمایوں نے اپنے درباریوں کے تین طبقے بنا دیے تھے۔ پہلا طبقہ اہلِ دولت کہلاتا تھا اور اس طبقے میں "اخوان و اقربا و امرأ و وزراء کافۂ سپاہیان" شامل تھے[1]۔ دوسرا طبقہ اہلِ سعادت کہلاتا تھا اور اس طبقے میں "فضلا و شعراء و موالی و اشراف و اہالی" شامل تھے[2]۔ تیسرا طبقہ اہلِ مراد کہلاتا تھا اور اس طبقے میں "اربابِ حسن و ملاحت و جوانانِ صاحبِ صباحت و سازندگان نغمہ پرداز و خوانندگان خوش آواز" شامل تھے[3]۔ قانونِ ہمایونی کی ایک عبارت سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ ہمایوں ہفتے میں دو روز اہلِ مراد کے ساتھ گزارتا تھا۔

---

۱ - اخوند امیر ، قانون ہمایونی ، مطبوعہ کلکتہ ۱۹۴۰ء ، ص ۳۴ -

۲ - ایضاً ، ص ۳۵

۳ - ایضاً -

اما روز دوشنبہ و چہار شنبہ را روز مراد خوانند و دران دو روز بعض ازندما و خواص و جمعی از اہل مراد و اختصاص را بمجلس فردوس صفت طلبیدہ بمنتہائے مرادات می رسانند و نکتہ در خصوصیت این دو روز با اہل مراد آنکہ روز دو شنبہ تعلق بقمر دار و چہار شنبہ بعطارد ، پس لائق می نماید کہ درین دو روز با جوانان قمر پیکر صحبت داشتہ بامتزاج نغمات و الحان ساز و آواز از دیار زیب و زینت بخشد[1]۔

”پیر اور بدھ کے دنوں کو روز مراد کہتے ہیں اور ان دونوں میں بادشاہ اپنے ندیموں ، خاص خاص مصاحبوں اور اہل مراد کے ایک گروہ کو اپنی مجلس فردوس صفت میں بلا کر ان کی مرادیں بر لاتے ہیں ۔ ان دو دنوں کو اہل مراد کے لیے مخصوص کرنے کا راز یہ ہے کہ پیر کا دن چاند اور بدھ کا دن عطارد کی طرف منسوب ہے ۔ اس لیے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں دن قمر پیکر جوانوں کی صحبت میں بسر کیے جائیں اور ملک ملک کے نغمہ و ساز سے محفل کو زینت بخشی جائے“۔

قانون ہمایونی کی روایت ہے کہ ہمایوں نے چار کمروں پر مشتمل ایک کشتی بنوائی تھی جس میں وہ اپنے مصاحبوں کے ساتھ دریا کی سیر کو جایا کرتا تھا ۔ اس کشتی کا ایک کمرہ موسیقاروں کے لیے وقف تھا ۔ ان کے گانے بجانے کی تصویر خواندامیر نے ان الفاظ میں کھینچی ہے :

سازندگان نغمہ پرداز و خوانندگان خوش آواز صورت رود و سرود بعشر نگاہ خورشید رسانیدہ ناہید را برقص می آورند[2]۔

”نغمہ پرداز سازندے اور خوش آواز گویے سازوں اور گانوں کی آواز کو سورج کی عشرت گاہ تک پہنچا کر ناہید کو نچا دیتے ہیں۔“

ہمایوں نے ”دولت خانہ طلسم“ کے نام سے ایک عمارت بنوائی تھی ، جس میں اکثر شاہی تقریبات منعقد ہوا کرتی تھیں ۔ ان تقریبات میں موسیقی کا

---

[1] ۔ خواندامیر ، قانون ہمایونی ، مطبوعہ کلکتہ ۱۹۴۰ء ، ص ۳۸۔

[2] ۔ ایضاً ، ص ۵۷ ۔

پروگرام بھی شامل ہوتا تھا ۔ خواندامیر رقمطراز ہے کہ دولت خانہ طلسم میں گانے والوں کی آواز پر رقاصہ فلک ناہید بھی بے خود ہو کر ناچنے لگتی تھی[1] ۔

شاہی دربار کے علاوہ کبھی کبھی شاہی حرم میں بیگمات کی موجودگی میں بھی مجلس طرب منعقد ہوا کرتی تھی جس میں سازندہا و گویندہا اپنے اپنے فن کا کمال دکھایا کرتے تھے[2] ۔

مرأۃ سکندری کی روایت ہے کہ فتح مانڈو کے موقع پر ہمایوں بہت خشمناک تھا ۔ اتفاق سے منگل کا دن تھا اور ہمایوں سرخ لباس پہن کر حرم سرا سے باہر آیا اور سپاہیوں کو قتل عام کا حکم دیا ۔ سپاہیوں نے بادشاہ کا اشارہ پاتے ہی شہر میں خون کی ندیاں بہا دیں ۔ حسن اتفاق سے سلطان بہادر شاہ کا درباری گویا ، منجھو[3] بھی اس ہنگامۂ دار و گیر میں ایک سپاہی کے ہاتھ لگا ۔ سپاہی نے ابھی تلوار کے قبضہ پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ منجھو نے اس سے کہا کہ میرے قتل سے بھلا تجھے کیا ملے گا ؟ میں سلطان بہادر شاہ کا مصاحب ہوں اگر تم میری جان بخشی کرو تو میں تمھیں اپنے وزن کے برابر سونا دوں گا ۔ سپاہی نے تلوار نیام میں ڈال لی اور اپنی پگڑی سے منجھو کے دونوں ہاتھ باندھ کر ایک محفوظ جگہ پر جا بیٹھا ۔ اتفاق سے ایک راجہ کا اس طرف گزر ہوا اور اس نے منجھو کو پہچان لیا اور اپنے ساتھ

---

۱ - ایضاً ، ص ۹۱ ۔

۲ - گلبدن بیگم ، ہمایوں نامہ ، مطبوعہ لاہور ۱۹۶۶ء ، ص ۸۲ ۔

۳ - (۱) شاہنواز خان نے اس کا نام بیجو لکھا ہے ۔ (مرأۃ آفتاب نما ، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی نمبر فارسی ۲۴ ورق ۳۹۲ ب) ۔

(۲) ایشوری پرشاد نے اس گویے کا نام بجو لکھا ہے ۔ (اے شارٹ ہسٹری آف مسلم رول ان انڈیا ، مطبوعہ الہ آباد ، ۱۹۳۰ء ، ص ۲۶۴) ۔

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

ہمایوں کے خیمہ کی طرف لے چلا ۔ وہ سپاہی بھی راجہ سے لڑتا جھگڑتا ہمراہ چلا آیا ۔ راجہ نے ہمایوں سے منجھو کی جان بخشی کی سفارش کی ۔ ہمایوں کا ایک درباری خوشحال بیگ قورچی ، جو ایک بار ہمایوں کا ایلچی بن کر سلطان بہادر شاہ کے دربار میں جا چکا تھا ، منجھو کے فضل و کمال سے واقف تھا ۔ اس نے بھی سفارش کی لیکن بادشاہ نے کوئی خاص توجہ نہ دی ۔ خوشحال بیگ نے موقع پاتے ہی دوبارہ منجھو کی سفارش کرتے ہوئے کہا کہ اس وقت اس جیسا کوئی گویا شاید ہی ہندوستان میں ہو ۔ بادشاہ نے منجھو کو کچھ سنانے کا حکم دیا اور اس نے فوراً یہ غزل چھیڑی :

(پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ)

(۳) منشی محمد اکرم امام خاں کے خیال میں اس کا صحیح نام بہنو ہے کیونکہ راجہ مان سنگھ تنوار نے مانکتو ہل میں ایسے ہی لکھا ہے ۔ (معدن الموسیقی ، مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۲۵ء ، ص ۲۷) ۔

(۴) ہمایوں کے سوانح نگار بیرجی نے بھی اس کا نام منجھو ہی لکھا ہے ۔ (ہمایوں بادشاہ ، مطبوعہ کلکتہ ۱۹۳۸ء ، ص ۱۳۴) ۔

(۵) عطیہ بیگم فیضی نے بھی اس کا نام بیجو ہی لکھا ہے ۔ ان کے خیال میں اس نے ایک ٹوڈی بھی ایجاد کی تھی ، جو سلطان بہادر شاہ کے نام کی رعایت سے ”بہادری ٹوڈی“ مشہور ہے ۔ (دی میوزک آف انڈیا ، مطبوعہ لندن ۱۹۲۵ء ص ۲۳) ۔

(۶) سکندر بن محمد نے مرأۃ سکندری میں اس کا نام منجھو لکھا ہے ، ہمارے خیال میں یہی نام صحیح ہے ۔ کیوں کہ سکندر خود بھی گجراتی تھا اور اس نے یہ پورا واقعہ اپنے والد سے روایت کیا ہے جو خود بھی اس مجلس میں موجود تھا ، جہاں یہ واقعہ پیش آیا تھا ۔ (ملاحظہ ہو مرأۃ سکندری ، مطبوعہ بمبئی ۱۳۰۸ھ ، ص ۲۵۰ ۔

کسے نہ ماند کہ او را بہ تیغِ ناز کشی[1]
مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشی

منجھو کا گانا ختم ہونے سے قبل ہی ہمایوں کا غصہ فرو ہو چکا تھا اور اس نے سرخ لباس اتار کر سبز لباس پہنا اور منجھو کو خلعت عطا کرتے ہوئے کہا کہ مانگو کیا مانگتے ہو؟ اس نے کہا کہ اس کے بہت سے رشتہ دار اس وقت قید میں ہیں، اُن کی رہائی کا حکم صادر فرمائیں۔ ہمایوں نے اپنا ترکش منجھو کی کمر سے باندھا اور اپنے خاص گھوڑے پر سوار کر کے چند مصاحب ساتھ کر دیے اور ان سے کہا کہ منجھو جس شخص کی طرف اشارہ کرے اُسے فی الفور رہا کر دیا جائے۔ منجھو نے اپنے عزیزوں کے علاوہ بے شمار قیدیوں کو رہا کرا دیا۔ کسی نے ہمایوں سے شکایت کی کہ اس نے تو ہر کس و ناکس کو اپنا رشتہ دار ظاہر کر کے رہا کرا دیا ہے۔ ہمایوں نے اس سے کہا کہ تم یہ کیا کہتے ہو؟

او اگر امروز استقرارِ سلطنت مرا از من می طلبید رد نمی کردم و بدل مطلوب او را می طلبیدم[2]۔

> ترجمہ: "آج اگر وہ مجھ سے میری سلطنت بھی مانگ لیتا تو میں انکار نہ کرتا اور دل کے ساتھ اس کا مقصد پورا کرتا"۔

ہمایوں نے منجھو کو اپنا مقرب بنا کر انعام و اکرام سے نوازنا شروع کیا لیکن اس کے باوجود وہ موقع پا کر بھاگ نکلا اور بہادر شاہ کے پاس جا پہنچا۔ ہمایوں کو اُس کے فرار کی خبر ملی تو اُس نے بے ساختہ کہا:

---

[1] ۱ - بعض روایتوں میں پہلا مصرع یوں بھی مرقوم ہے:

کسی نماند کہ دیگر بہ تیغِ ناز کشی

(ملاحظہ ہو: خلاصۃ العیش عالم شاہی، قلمی نسخہ رضا لائبریری رام پور، نمبر فارسی ۱۵۵، ورق ب ۱۴۷)۔

[2] ۲ - سکندر بن محمد: مرأت سکندری، مطبوعہ بمبئی ۱۳۰۸ھ، ص ۲۵۰۔

> لم بختی او مرا این داشت و الا ما این قدر نوازش می فرمودیم کہ ہرگز سلطان بہادر را یاد نمی آورد[۱]۔
>
> "یہ اس کی بدبختی تھی جو اس نے ایسا کیا ورنہ ہم اسے اتنا انعام و اکرام دیتے کہ وہ سلطان بہادر شاہ کا نام زبان پر نہ لاتا"

سکندر بن محمد کی روایت ہے کہ جب منجھو ہمایوں کے دربار سے بھاگ کر سلطان بہادر شاہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس نے مسرت کے ساتھ کہا :

> امروز آنچہ از من رفتہ بود ، ہمہ باز آمد یعنی منجھو را کہ دیدم رخت غم و غصہ را از ساحت خاطر بیروں کشیدم ۔ دیگر مرا آرزوی نماندہ آنچہ از خدا می طلبیدم کہ بمن رسانید[۲]۔
>
> "جو کچھ مجھ سے چھن گیا تھا وہ آج مجھے دوبارہ مل گیا ہے ۔ منجھو کو دیکھتے ہی میرا غم و غصہ جاتا رہا ہے ۔ اب میری اور کوئی خواہش نہیں رہی ، میں نے جو کچھ خدا سے مانگا تھا وہ اس نے مجھے دے دیا ہے"۔

سلطان بہادر شاہ جو سلطنت چھن جانے کے باوجود منجھو کو پا کر اتنا خوش ہوا تھا اس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ وہ اہل فضل و کمال اور گانے بجانے والوں کے حق میں بڑا فراخ دل واقع ہوا تھا ۔ تاریخ گجرات کا مصنف میر ابو تراب ولی رقمطراز ہے کہ سلطان ایک ایک مجلس میں گویوں اور مسخروں کو لاکھوں بلکہ کروڑوں روپے بخش دیتا تھا[۳]۔

شیر شاہ سے شکست کھا کر جب ہمایوں سندھ کے ریگزاروں میں قسمت آزمائی کرتا پھرتا تھا تو اس عالم حسرت و یاس میں قدرت نے اسے فرزند عطا فرمایا ۔ ہمایوں کو بیٹے کی پیدائش کی خوشخبری ملی تو وہ فوراً اپنے پروردگار کے حضور میں سجدہ ریز ہوا ۔ اس کے بعد اس نے جشن منانے کا حکم دیا ۔

---

۱ ۔ سکندر بن محمد ، مراۃ سکندری ، مطبوعہ بمبئی ۱۳۰۸ھ ، ص ۲۵۰ ۔

۲ ۔ ایضاً ۔

۳ ۔ میر ابو تراب ولی ، تاریخ گجرات ، مطبوعہ کلکتہ ۱۹۰۹ء ، ص ۲۵ ۔

نقارچیوں نے نقاروں پر ضرب لگائی - اس صحرائے بے آب و گیاہ میں بھی اس نے مطرب ، مغنی ، عود نواز اور قانون بجانے والے طلب کیے اور انھوں نے اپنے رنگا رنگ نغمات اور دلکش سازوں کے ساتھ حاضرین کی خوشی کو دوبالا کر دیا[1] -

ہمایوں جب ہندوستان سے ایران روانہ ہوا تو ہرات میں سلطان محمود میرزا نے اس کا بڑا پر تپاک خیر مقدم کیا - ایک روز میرزا نے ہمایوں کے اعزاز میں ایک جشن ترتیب دیا اور اس موقعہ پر خراسان کے مشہور مغنی صابر قاق نے ایک غزل پیش کی - جس کا مطلع یہ تھا :

مبارک منزلے کآں خانہ را ماہے چنیں باشد
ہمایوں کشورے کآں عرصہ را شاہے چنیں باشد

جب مغنی اس شعر پر پہنچا :

ز رنج و راحتِ گیتی مرنجاں دل بشو خرم
کہ آئین جہاں گاہے چناں گاہے چنیں باشد

عبدالباقی نہاوندی کا یہ کہنا ہے کہ اس شعر کو سن کر ہمایوں کے دل پر ایک چوٹ سی لگی اور اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو ٹپک پڑے[2] -

بایزید بیات جو اس سفر میں ہمایوں کے ہمرکاب تھا ، لکھتا ہے کہ گورنر خراسان کے حکم سے گانے بجانے والوں کی ایک جماعت ہر وقت مستعد رہتی تھی اور انھیں یہ حکم تھا کہ جس وقت ہمایوں انہیں طلب کرے وہ حاضر خدمت ہو کر ساز و نغمہ سے اس کا دل بہلائیں[3] . اس جلا وطنی اور بے سروسامانی کے عالم میں بھی موسیقی کے ساتھ ہمایوں کی دلبستگی کا یہ عالم

---

۱ - صباح الدین عبدالرحمٰن ، ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے ، مطبوعہ اعظم گڑھ ۱۹۶۳ء ، ص ۲۸۳ -

۲ - عبدالباقی نہاوندی ، مآثر رحیمی ، مطبوعہ کلکتہ ۱۹۲۴ء ، جلد اول ، ص ۵۸۸ -

۳ - بایزید بیات ، تذکرہ ہمایوں و اکبر ، مطبوعہ کلکتہ ۱۹۴۱ء ، ص ۲۶ -

تھا کہ جب وہ ہرات سے مشہد روانہ ہوا تو سازندوں اور گویوں کی ایک پارٹی اس کے ہمرکاب تھی جو دوران سفر ساز و نغمہ سے اس کا دل بہلاتی رہتی تھی[1]۔

جوہر آفتابچی بھی ایران کے سفر میں ہمایوں کے ساتھ گیا تھا۔ اس کی روایت ہے کہ ایک بار ہمایوں نے شاہ طہماسپ کے اعزاز میں ایک دعوت دی۔ اس موقع پر شاہ کی فرمائش پر ہمایوں نے ہندوستانی کھانے تیار کرائے۔ کھانے کے بعد شراب کا دور شروع ہوا اور اس موقع پر گلو کاروں، بربط بجانے والوں اور نے نوازوں نے اپنے فن کا بہترین مظاہرہ کیا[2]۔

ایران سے واپسی پر جب ہمایوں نے کابل پر اپنا تسلط جما لیا تو ہندوستان کی فتح سے پہلے اس نے بدخشاں کو زیر کرنا مناسب سمجھا۔ بدخشاں کی مہموں میں بایزید بیات اس کے ہمراہ تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ بدخشاں کی مہمیں جاری تھیں کہ ایک روز ہمایوں نے ایک مجلس طرب آراستہ کی جس میں قُبصی، محمد جان قانونی، کچک غچکی، طوفان ربابی، قاسم چنگی اور طوفان نے نواز جیسے سازندے اور حافظ سلطان محمد رخنہ، حافظ کمال الدین حسین، حافظ مہری اور مُلا میر جان پیوندی جیسے ممتاز گوکار شریک ہوئے[3]۔

فتح ہندوستان کے بعد ہمایوں صرف چند ماہ زندہ رہا اور اس کا یہ تمام تر وقت بقول احمد یادگار — عیش و عشرت و جشن ہائے عالی — کی نذر ہوا[4]۔

ہمایوں کے عہد حکومت میں تاریخ رشیدی کا فاضل مصنف میرزا حیدر دوغلات کشمیر کا گورنر تھا اور اس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنے دور اقتدار میں کشمیر میں شعر و نغمہ کو عام رواج دیا[5]۔ راجہ مان سنگھ

---

[1] بایزیدبیات، تذکرہ ہمایوں و اکبر مطبوعہ کلکتہ ۱۹۴۱ء، ص ۳۱ -

[2] جوہر آفتابچی، تذکرۃ الواقعات (اردو ترجمہ) مطبوعہ کراچی، ص ۱۰۹ -

[3] بایزیدبیات، تذکرہ ہمایوں و اکبر، ص ۱۰۰ -

[4] احمد یادگار، تاریخ شاہی مطبوعہ کلکتہ ۱۹۳۹ء، ص ۳۴۱ -

[5] مجمع الشعراء جہانگیر شاہی، مخطوطہ بوڈلین لائبریری آکسفورڈ، ورق ۱۳ ب -

تنوار والیٔ گوالیار کے درباری گویے نائک بخشو کا انتقال ہمایوں کی تخت نشینی سے پہلے ہو چکا تھا ۔ البتہ اس کی بیٹی ہمایوں کے عہدِ حکومت میں بقیدِ حیات تھی ۔ وہ فن موسیقی میں اپنے نامور باپ کی صحیح جانشین سمجھی جاتی تھی ، اس کے ماہر فن ہونے کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کا موسیقارِ اعظم میاں تان سین اس کا شاگرد تھا[1] ۔

ہمایوں کے عہدِ حکومت میں موسیقی کی سرپرستی میں بعض صوفیائے کرام بھی بادشاہ سے کسی طرح پیچھے نہ تھے ۔ شاہی دربار کے باہر صوفیائے کرام کی خانقاہیں موسیقی کا سب سے بڑا گہوارہ سمجھی جاتی تھیں ۔ ہمایوں کے عہد میں حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ چشتیہ سلسلہ کے سربراہ تھے اور آپ کثرت کے ساتھ سماع سنتے تھے ۔ لطائف قدوسی کے مندرجات سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ آپ پر ہر وقت جذب و مستی کا عالم طاری رہتا تھا ۔ آپ کے صاحبزادے رقمطراز ہیں کہ ہمارے والد ماجد کی شادی کی تقریب میں جونہی ڈومنیوں نے یہ دوہڑا گایا :

کھو کھہ کھول دینا شہہ دیکھا لوری
اس گھونگھٹ کی کارن شہہ ہاتھ مروری

حضرت قطبی را حالِ وجد غالب آمد و سوزِ عشق پیدا شد ، از تختِ عروسی افتادند و در تواجد رقص فرمودند و جامہا عروسی ہماں ساعت پارہ پارہ کردند[2] ۔

ترجمہ : ”حضرت قطب صاحب میں سوزِ عشق پیدا ہوا اور آپ وجد میں آ گئے اور اسی عالم میں مسندِ عروسی سے نیچے گر پڑے ۔ آپ نے فی الفور اپنا عروسی جوڑا چاک کر ڈالا اور وجد کے عالم میں رقص کرنے لگے“ ۔

---

۱ ۔ محمد اسلم ، شاہجہان کا ذوق موسیقی ، مطبوعہ روزنامہ امروز لاہور ، ۹ مارچ ۱۹۶۹ء ، ص ۷ ۔

۲ ۔ شیخ رکن الدین ، لطائف قدوسی ، مطبوعہ دہلی ۱۳۱۱ھ ، ص ۱۲ ۔

شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کے صاحبزادوں نے ان کی نشست و برخاست کے لیے جماعت خانہ کے صحن میں ایک چھپر ڈال دیا تھا اور اسی کے نیچے اکثر مجالس سماع منعقد ہوا کرتی تھی اور آپ سماع سنتے سنتے وجد میں آ کر رقص کرنے لگتے - شیخ رکن الدین نے لطائف قدوسی میں ایک محفلِ سماع کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے :

> محمود قوال از گجرات آمده بود - ہماں ساعت حاضر شده و سرود گفت ، حضرت قطبی را حالت بسیار و وجد برکمال پیدا شد آں چھپر را از صحن جماعت خانہ شکستہ کرده بروں انداختند و در صحن رقص و تواجد شد[1] -

ترجمہ : ”محمود قوال گجرات سے (گنگوہ) آیا اور اسی لمحے حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا - محمود نے قوالی شروع کی - جسے سن کر حضرت قطب صاحب کی حالت غیر ہونے لگی اور ان پر وجد طاری ہوا اسی عالم میں آپ نے وہ چھپر جماعت خانہ کے صحن سے اکھاڑ کر باہر پھینک دیا اور صحن میں رقص کرنے لگے“ -

شیخ عبدالقدوسؒ گنگوہی نے جوازِ سماع بالمزامیر کے موضوع پر متعدد رسائل تحریر کیے تھے جو زمانے کی دستبرد سے ہم تک نہیں پہنچ سکے - شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے ملفوظات میں ان رسائل کا ذکر آیا ہے[2] -

عہدِ ہمایوں میں حضرت محمد غوث گوالیاریؒ کی خانقاہ موسیقاروں کا ملجا و ماویٰ تھی - تان سین کے والد مکرند پانڈے کو حضرت کے ساتھ بڑی عقیدت تھی[3] تان سین آپ ہی کی دعا سے پیدا ہوا اور بچپن میں آپ ہی کی توجہ سے مشرف باسلام ہوا[4]- مکرند پانڈے نے تان سین کو بچپن ہی میں حضرت کے

---

۱ - شیخ رکن الدین ، لطائف قدوسی ، مطبوعہ دہلی ۱۳۱۱ھ ، ص ۳۲ -

۲ - ملفوظات شاہ عبدالعزیز ، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۰ء ، ص ۹۲ -

۳ - شمس کنول ، ”علم موسیقی“ ، ماہنامہ آج کل دہلی موسیقی نمبر اگست ۱۹۵۶ء ، ص ۱۶ -

۴ - خلاصۃ العیش عالم شاہی ، مخطوطہ رضا لائبریری رام پور ، ورق ۱۴۸ ب-

پاس چھوڑ دیا تھا حضرت نے کمال شفقت سے اس کی پرورش کی اور ماہر اساتذہ کی نگرانی میں اُسے موسیقی کی تعلیم دلوائی اور یہ حضرت ہی کا فیضان نظر تھا کہ تان سین ہندوستان کا موسیقار اعظم کہلایا اور ابوالفضل یہ لکھنے پر مجبور ہوا کہ گزشتہ ہزار سالوں میں اس کی نظیر ہندوستان میں نہیں ملتی[1]۔ تان سین کے علاوہ بیجو باورے کی تربیت میں بھی حضرت گوالیاریؒ کا بڑا حصہ ہے۔

حضرت محمد غوثؒ کو خود بھی موسیقی میں بڑا درک حاصل تھا۔ ان کا ہم عصر مؤرخ بدایونی، جو ایک بار اُن کی زیارت سے بھی مشرف ہو چکا تھا، ان کے متعلق لکھتا ہے:

> خانقاہی تعمیر فرمودہ بسماع و سرود و وجد اشتغال داشت و خود درآن وادی تصنیف میکرد[2]۔

> "آپ نے خانقاہ بنوائی تھی۔ اکثر سماع نغمہ اور وجد میں مشغول رہتے تھے۔ اس فن میں آپ نے تصنیفی کام بھی کیا ہے"۔

ہمارے خیال میں موسیقی ایک لطیف فن تھا اور صوفیائے کرام کی خانقاہوں میں موسیقی کو غذائے روح سمجھ کر سنا جاتا تھا۔ ایک ماہر موسیقار جناب شمس کنول اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ترجمہ: "فنِ موسیقی فنونِ لطیفہ میں سے ایک بڑا لطیف فن ہے جس سے قلب انسانی پر مختلف کیفیتیں طاری ہوتی ہیں۔ کبھی دل حسرت و غم میں ڈوب جاتا ہے اور کبھی اس میں جوش و سرور پیدا ہوتا ہے اور اس طرح انسان کے مختلف جذبات مشتعل ہو جاتے ہیں۔ صوفیائے کرام اور سنت سادھوؤں کا طبقہ موسیقی کو تزکیۂ نفس اور تصفیۂ باطن کا ذریعہ سمجھتا ہے"[3]۔

۱۔ ابو الفضل، آئین اکبری، جلد اول، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۷۲ء، ص ۲۶۰۔

۲۔ عبدالقادر بدایونی، منتخب التواریخ، جلد سوم، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۹ء ص ۵۔

۳۔ شمس کنول، "علم موسیقی" ماہنامہ آج کل دہلی، موسیقی نمبر اگست ۱۹۵۶ء، ص ۱۶۔

بڑے بڑے صوفیائے کرام نے موسیقی کی نوک پلک سنوارنے اور اسے بام عروج تک پہنچانے میں اپنا خون پسینہ ایک کر دیا ہے ۔ اس ضمن میں حضرت محمد غوث گوالیاریؒ کے علاوہ ، امیر خسروؒ ، صوفی بہاء الدین برناویؒ صوفی شیر محمد ، شیخ پیر میرٹھی ، نظام الدین مدھ نائک ، میراں سید شاہ حسینؒ اور حضرت سید شاہ جمالؒ کے نام پیش کیے جا سکتے ہیں ۔ ہماری یہ رائے ہے کہ موسیقی جب تک طوائف کے کوٹھے تک نہیں پہنچی تھی اس وقت تک اسے ایک پاکیزہ فن تصور کیا جاتا تھا ۔ یہی وجہ تھی کہ بڑے بڑے خدا رسیدہ درویشوں نے اسے پروان چڑھانے میں اپنی عمریں صرف کر دیں اور اسے اپنے لیے بالکل عار نہ سمجھا ۔

خشک نی و خشک چوب و خشک پوست
از کجا می آید این آوازِ دوست

(رومی)

دورِ اکبر میں موسیقی اور موسیقار

اکبر نے موسیقی کا ذوق اپنے والد نصیر الدین ہمایوں سے ورثہ میں پایا تھا[1]۔ اس کے ہاں ایسے ایسے باکمال سازندے اور گویے موجود تھے کہ بسا اوقات اس کے دربار پر میوزک اکیڈمی ہونے کا گمان گزرنے لگتا ہے۔ اکبر اعظم کا درباری مؤرخ ابوالفضل رقمطراز ہے کہ اس فن پر قبلہ عالم کی خاص توجہ تھی اور وہ موسیقاروں کے سرپرست و مربی تھے۔ بارگاہ عالی میں بے شمار ہندوستانی، ایرانی، تورانی اور کشمیری نغمہ پرداز جمع تھے جن میں بلا امتیاز مرد اور عورت دونوں شامل تھے۔ جہاں پناہ نے درباری گویوں کو سات گروہوں میں تقسیم فرمایا تھا اور ہر گروہ ہفتے میں ایک روز حاضر ہوکر اپنے کمالات کا مظاہرہ کرتا اور سامعین کے قلوب کو کانوں کے ذریعے سے بادۂ معرفت کا متوالا بنا کر کسی کو مست اور کسی کو ہوشیار کرتا تھا[2]۔ ابوالفضل کے بیان کے مطابق چھتیس گویے اور سازندے شاہی دربار میں ملازم تھے۔ ان میں سے گانے والوں میں میاں تان سین اور اس کا بیٹا تان ترنگ خان، سبحان خان اور اس کا بھائی بجتر خان، ملا اسحٰق اور اس کا بھائی رحمت اللہ، بابا رام داس اور اس کا بیٹا سور داس، سرود خان، داؤد، سرگیان خان، محمد خان، میاں لال، چاند خان، نائک چارجو اور رنگ سین خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اسی طرح طنبورہ نوازوں میں استاد محمد حسین، استاد محمد یوسف، سلطان ہاشم اور استاد محمد امین۔ قانون بجانے والوں میں میر عبداللہ، سارنگی نوازوں میں میر سید علی اور بہرام قلی، سرمنڈل بجانے میں میر منڈل خان بنسری بجانے میں استادہ ست، بھاؤ بتانے میں پیر زادہ، حافظ خواجہ علی اور سلطان بیگ، بین بجانے میں صاحب خان اور پربین خان، سرنا پھونکنے میں

---

[1] ۔ ملاحظہ ہو راقم الحروف کا مضمون "ہمایوں کا ذوق موسیقی" مطبوعہ ماہنامہ المعارف، لاہور، بابت جولائی ۱۹۷۱ء۔

[2] ۔ ابوالفضل، آئین اکبری، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۷۲ء، ج ۱، ص ۲۶۳۔

اُستاد شاہ محمد ، قبز نوازی میں تاش بیگ اور کرنا پھونکنے میں شیخ دادن اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔[۱] قاسم نامی ایک موسیقار نے قبز اور رباب کے درمیان ایک ساز ایجاد کیا تھا جسے وہ دربار میں بجایا کرتا تھا ۔

” آئین اکھاڑہ“ کے تحت ابوالفضل لکھتا ہے کہ آباد مملکت کے ذی عزت و اہل ثروت افراد کے گھروں میں مجالس عیش منعقد کی جاتی تھیں ۔ قاعدہ یہ تھا کہ کنیزوں کو ساز و نغمہ کی تعلیم دی جاتی تھی اور چار خوش رنگ عورتیں ناچتی تھیں اور عجیب اُصول ظاہر ہوتے تھے ۔ دوسری چار عورتیں نغمہ سرائی کرتی تھیں ، ان میں سے دو پکھاوج بجاتی تھیں اور باقی دو اپنگ ، اسی طرح ایک عورت رباب ، ایک ڈھولک ، ایک بین اور ایک چتر بجاتی تھی ۔ اسی طرح دو عورتیں ہاتھوں میں چراغوں کے تھال لے کر ان کے گرد گھومتی رہتی تھیں[۲] ۔ اسی ضمن میں ابوالفضل کی رائے یہ ہے کہ قبلہ عالم سنگیت اور اس کے علاوہ دیگر امور میں دقیق معلومات رکھتے تھے اور جو امور تمام عالم کے لیے کمال غفلت کا موجب ہو سکتے تھے وہ گیتی خداوند کے لیے بیداری کا باعث تھے[۳] ۔

”شمارہ نغمہ سرایان“ کے سلسلے میں ابوالفضل نے گانے والوں کی گیارہ اقسام بتائی ہیں :

۱ ۔ کلاونت

یہ صرف دھرپد گاتے تھے ۔

۲ ۔ ڈھاڈی

اکبری دور میں پنجابی گویوں کو ڈھاڈی کہتے تھے ۔ یہ کنگرہ اور ڈھڈہ نامی ایک ساز بجاتے تھے ، اسی مناسبت سے ان کا نام ڈھاڈی پڑ گیا تھا ۔ یہ لوگ میدانِ جنگ میں رجز بھی خوب پڑھتے تھے ۔

---

[۱] ۔ ایضاً ، ص ۲ - ۲۶۳ ۔

[۲] ۔ ایضاً ، ج ۲ ، ص ۲۲۶ ۔

[۳] ۔ ایضاً ، ص ۲۲۶ ۔

۳ ۔ ہرکیہ

یہ لوگ ہرک (آوج) نامی ایک ساز بجاتے تھے ، اسی تعلق سے ان کا نام ہرکیہ پڑ گیا تھا ۔ یہ دھرپد بھی گا لیتے تھے ۔ اس گروہ میں عورتیں بھی شامل ہوتی تھیں ۔

۴ ۔ دف زن

اس گروہ میں صرف ڈھاڈی عورتیں شامل تھیں ۔ وہ بیاہ شادی اور ولادت کے موقعوں پر دف بجایا کرتی تھیں ۔ انھیں مردوں کی محفل میں جاکر گانے بجانے میں بھی کوئی باک نہ تھا ۔

۵ ۔ سہزدہ تالی

یہ گروہ صرف گجرات اور مالوہ میں رہتا تھا ۔ اس میں شامل مرد دف بجاتے تھے اور عورتیں پاؤں کی تھاپ سے سیزدہ تالی بجاتی تھیں ۔

۶ ۔ نٹوہ

انھیں ناچنے اور گانے کے علاوہ پکھاوج ، نال اور رباب بجانے میں بھی ماہر سمجھا جاتا تھا ۔

۷ ۔ کیرتنیہ

یہ لوگ زنار دار ہندو تھے اور نو عمر لڑکوں کو زنانہ لباس پہنا دیتے تھے ۔ یہ صرف کشن جی کی مدح میں بھجن گایا کرتے تھے اور ان کے ساز پیشینیاں یعنی پرانے وقتوں کے لوگوں جیسے ہوتے تھے ۔

۸ ۔ بھگتیہ

یہ کیرتنیہ جیسے ساز بجاتے لیکن مردوں کی صورت میں رہتے تھے اور اکثر رات کو گاتے تھے ۔

۹ ۔ بھنویہ

یہ طبقہ بھگتیہ سے ملتا جلتا تھا لیکن تھال میں بیٹھ کر گاتا تھا ۔ اس کے گانے کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا ۔ یہ لوگ اکثر تماشے بھی دکھایا کرتے تھے ۔

۱۰ ۔ بھانڈ

یہ فرقہ ڈھول اور تال بجاتا اور نغمے گاتا تھا ۔ ناچ سے بھی کماحقہ واقف تھا ۔ اپنے فن کا مظاہرہ کرتے وقت یہ لوگ اپنے تمام اعضاء ہلاتے تھے۔ انہیں انسانوں اور جانوروں کی نقلیں اتارنے میں بھی مہارت تھی ۔

۱۱ ۔ کنجری

اس گروہ میں مرد اور عورتیں دونوں شامل تھے ۔ مرد عموماً پکھاوج ، رباب اور تال بجاتے تھے اور عورتیں ناچتی اور گاتی تھیں ۔ اکبر اعظم کو اس گروہ کا نام ناپسند تھا ، اس لیے وہ انہیں کنجری کی بجائے کنچنی کہا کرتا تھا[1] ۔

اکبری دور میں شاہی تقریبات اور جشنوں کے موقع پر راگ و رنگ کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی ۔ ابوالفضل لکھتا ہے کہ ان موقعوں پر ہر پہر کے آغاز پر نقارے بجائے جاتے تھے اور اربابِ نشاط اپنی نغمہ سرائی اور ساز نوازی سے ہنگامۂ عیش برپا کر دیتے تھے[2] ۔ عہدِ اکبر کا شہرۂ آفاق مؤرخ ملا نظام الدین احمد جشن نو روز کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ بادشاہ روز و شب اس جشن میں شرکت کرتا تھا اور اس کے ساتھ ہندوستانی اور ایرانی گویے ہوا کرتے تھے[3] ۔ طبقات اکبری کے اندراجات سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ ہر جشن کے موقع پر موسیقار پیش پیش ہوا کرتے تھے ۔ جشن نوروز کے موقع پر اکبر فرنگیوں سے بھی "موسیقیٔ فرنگ" سن کر محظوظ ہوتا تھا[4] ۔

ہندوستانی ، ایرانی ، تورانی اور کشمیری موسیقی کے علاوہ فرنگیوں کی آمد و رفت کے بعد اکبر نے "موسیقیٔ فرنگ" سننے کا ذوق پیدا کر لیا تھا۔

---

۱ ۔ ایضاً ، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۷۷ء ، ج ۲ ، ص ۳ - ۱۳۲ ۔

۲ ۔ ایضاً ، ج ۱ ، ص ۳۱۱ ۔

۳ ۔ نظام الدین احمد ، طبقات اکبری ، مطبوعہ کلکتہ ۱۹۳۱ء ، ج ۲ ، ص ۲۵۶ ۔

۴ ۔ محمد حسین آزاد ، دربارِ اکبری ، مطبوعہ ، لاہور ۱۹۳۷ء ، ص ۱۵۲ ۔

عبدالقادر بدایونی لکھتا ہے کہ حاجی حبیب اللہ فرنگستان سے ارغنون[۱] نامی ایک باجہ لایا جو عجائب مخلوقات میں شمار ہوتا تھا۔ بادشاہ نے یہ باجہ اہل دربار کو دکھایا اور اسے سن کر بے حد محظوظ ہوا۔ یہ باجہ ایک قدِ آدم صندوق تھا جس پر مور کے پر لگے ہوئے تھے۔ ایک فرنگی اس کے اندر بیٹھ کر اس کے تار ہلاتا اور دو فرنگی باہر بیٹھ کر مور کے پروں کی جڑوں پر انگلیاں مارتے تھے۔ اللہ اللہ، اس میں سے کیسی کیسی روح پرور آوازیں نکلتی تھیں[۲]۔

اکبر پر موسیقی کے اثر کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۹۶۸ھ میں وہ دارالحکومت سے شکار کے ارادہ سے نکلا۔ فتح پور سیکری کے قریب منڈاکر نام کے ایک گاؤں میں قوالی ہو رہی تھی اور قوال خواجہ معین الدین اجمیریؒ کی منقبت گا رہے تھے۔ قوالوں کی زبان سے خواجہ غریب نواز کی منقبت سن کر اکبر پر ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ اس نے وہیں سے اجمیر کی طرف باگ موڑ لی[۳]۔

اکبری دور کے موسیقار

اکبر کے ذوق موسیقی کو جلا بخشنے میں میاں تان سین کا بڑا حصہ ہے اس کے کمال کی بدولت اکبر نے کلاسیکی موسیقی میں اعلیٰ ذوق پیدا کر لیا تھا۔ تان سین، جس کا نام سن کر گویے کان پکڑتے ہیں[۴] گوالیار کے ایک نواحی گاؤں کا رہنے والا تھا۔ اس کا والد مکرند پانڈے گوڑ برہمن تھا اور

---

[۱] - مولانا مناظر احسن گیلانی کے خیال میں جس ساز کو بدایونی ارغنون لکھتا ہے وہ پیانو ہے۔
ملاحظہ ہو: تذکرہ مجدد الف ثانی، مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۵۹ء، ص ۵۵ -

[۲] - عبدالقادر بدایونی، منتخب التواریخ، مطبوعہ نولکشور ۱۲۸۴ھ، ص ۲۳۴ -

[۳] - سمتھ، وی اے، اکبر دی گریٹ مغل، مطبوعہ دہلی ۱۹۶۲ء، ص ۲۴۲ -

[۴] - محمد مراد علی خان رعنا، غنچۂ راگ، مطبوعہ نولکشور لکھنؤ ۱۸۶۳ء، ص ۱۳۲ -

اُسے حضرت محمد غوث گوالیاریؒ سے بڑی عقیدت تھی - مکرنڈ پانڈے اولاد جیسی نعمت سے محروم تھا اس لیے ایک بار اس نے حضرت محمد غوثؒ سے درخواست کی کہ وہ خدا سے دعا کریں کہ اُسے اولاد عطا فرمائے - حضرت محمد غوثؒ کی دعا سے تان سین پیدا ہوا[١] - جب تان سین پانچ سال کی عمر کو پہنچا تو مکرنڈ پانڈے اُسے لے کر حضرت محمد غوثؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے درخواست کی کہ وہ دعا کریں کہ تان سین سنگیت میں نام پیدا کرے - حضرت محمد غوثؒ اس وقت پان چبا رہے تھے - چنانچہ انھوں نے اپنا لعاب دہن تان سین کے منہ میں ڈال دیا - اس پر مکرنڈ پانڈے نے کہا کہ حضرت یہ ہمارے دھرم سے نکل گیا ہے اس لیے اب یہ آپ ہی کے چرنوں میں رہا کرے گا[٢] - حضرت محمد غوثؒ نے اپنے بیٹوں کی طرح تان سین کی پرورش شروع کی اور گوالیار کے نامی گرامی موسیقاروں کی نگرانی میں اُسے موسیقی کی تعلیم دلوائی - تان سین نے کچھ عرصہ سلطان عادل شاہ کے سامنے بھی زانوئے تلمذ تہ کیا[٣] اور بعدازاں دکن جا کر نائک بخشو کی بیٹی سے راگ کی تعلیم پائی[۴] - بعض روایتوں میں آیا ہے کہ تان سین نے بابا ہری داس سے بھی راگ ودیا کی تعلیم حاصل کی تھی[٥] -

تان سین کو تا زندگی حضرت محمد غوثؒ سے ایک گونا عقیدت رہی - وہ انھی کی توجہ سے مسلمان ہوا تھا اور بعد ازاں ان کے حلقۂ مریدین میں بھی

---

[١] - صادق علی خان ، سرمایۂ عشرت ، مطبوعہ مطبع نارائنی ١٨٧٣ء ، ص ٢ - ٣٢١ -

[٢] - ایضاً ، ص ٣٢٢ -

[٣] - محمد اسلم ، شاہانِ مغلیہ کا ذوق موسیقی مشمولہ "تاریخی مقالات" مطبوعہ لاہور ١٩٧٠ء ، ص ١٠٧ -

[۴] - صادق علی خان ، سرمایۂ عشرت ، مطبوعہ مطبع نارائنی ١٨٧٣ء ، ص ٣٢٢ -

[٥] - عبدالحلیم ، ایسیزآن ہسٹری آف انڈو پاک میوزک ، مطبوعہ ڈھاکہ ١٩٦٢ء ، ص ٢٦ -

داخل ہوگیا تھا[1] - پیر و مرید کا یہ رشتہ ابدی ہے اور تان سین آج بھی حضرت محمد غوثؒ کی خانقاہ کے احاطہ میں مدفون ہے - اس کا مزار بھی اپنے مرشد کے مزار کی طرح مرجع خلائق ہے اور برعظیم کے نامی گرامی گویے وہاں گانا اپنے لیے باعث فخر سمجھتے ہیں -

تکمیل تعلیم کے بعد تان سین نے راجہ رام چندر کی ملازمت اختیار کرلی۔ راجہ مذکور تان سین کا بڑا قدر دان تھا اور بدایونی نے تحریر کیا ہے کہ ایک بار اس نے تان سین کا گانا سن کر اسے ایک کروڑ دام بطور انعام عطا کیے تھے[2] -

جب تان سین کے فن کا شہرہ اکبر کے دربار تک پہنچا تو اس نے راجہ رام چندر سے کہہ کر اسے آگرہ طلب کر لیا - اکبر کے دربار میں تان سین کو ایک خاص مقام حاصل تھا اور وہ ہمیشہ اکبر کا منظور نظر رہا -

تان سین نے اکبر کے ذوق کے پیش نظر درباری کانہرہ ، دربار کایان ، درباری اساوری اور شہانہ جیسے راگ مرتب کیے[3] - ڈاکٹر عبدالحلیم کی تحقیق کے مطابق میاں کی ملہار ، میاں کی ٹوڈی اور میاں کی سارنگ بھی تان سین ہی کے ایجاد کردہ راگ ہیں[4] - خوش قسمتی سے تان سین کے ایجاد کردہ راگوں کے مسودات رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہیں اور ایتھل روز نتھال نے اپنی تصنیف میں ان سے پوری طرح فائدہ اٹھایا ہے[5] -

---

[1] - محمد مسعود احمد ، شاہ محمد غوث گوالیاری ، مطبوعہ میر پور ۱۹۶۴ء ، ص ۱۳۰ -

[2] - عبدالقادر بدایونی ، منتخب التواریخ ، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۵ء ، ج ۲ ، ص ۳۳۵ -

[3] - محمد اشفاق علی خان ، نغمات الہند ، مطبوعہ نظامی پریس لکھنؤ ، ص ۷۸ -

[4] - عبدالحلیم، ایسیز آن ہسٹری آف انڈو پاک میوزک ، مطبوعہ ڈھاکہ ۱۹۶۲ء ص ۲۹ -

[5] - روز نتھال، دی سٹوری آف انڈین میوزک اینڈ آرٹس انسٹرومنٹس، مطبوعہ لندن ۱۹۲۸ء ، ص ۸۰ -

تان سین نے فنِ موسیقی کی جو خدمت انجام دی ہے اس کے متعلق سید عابد علی عابد تحریر فرماتے ہیں کہ اس نے کلاسیکی سنگیت کو نیا رس، نئی حلاوت اور نیا بانکپن بخشا۔ اس نے راگوں میں نہایت دلکش تصرفات کیے اور یہ راگ ان تصرفات کے ساتھ اب اس کے نام سے منسوب ہیں، مثلاً میاں کی ٹوڈی، میاں کی ملہار، لیکن جس راگ کی بدولت تان سین کا نام کلاسیکی سنگیت میں ہمیشہ زندہ رہے گا وہ درباری ہے، جسے سن کر بقول اکبر دل کی سوئی ہوئی تمنائیں جاگ اٹھتی تھیں اور بڑے بڑے کام کرنے کے ولولے بیدار ہوتے تھے[1]۔

درباری کے متعلق پروفیسر خادم محی الدین لکھتے ہیں کہ یہ اول شب گذر جانے اور آدھی رات شروع ہونے سے کچھ عرصہ پیشتر گایا جاتا ہے، جونہی اس کے دھیمے ابتدائی سر۔ ”نی سارے سادھانی پا“ گانے شروع کیے جائیں، سن کر طبیعت میں سکون پیدا ہوتا ہے۔ اس راگ کے سروں کے بیشتر حصے کا زور نیچے کے سپتک پر رہتا ہے۔ شہنشاہ اکبر کا یہ مرغوب راگ تھا۔ امورِ سلطنت کے خرخشوں اور جھمیلوں میں دن بھر مصروف رہنے کے بعد شاہ کو امن اور سکون مطلوب تھا اس لیے تان سین یہ راگ پیش کرتا تھا[2]۔

ہندوستانی موسیقی کو پروان چڑھانے میں تان سین نے جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں ان کی بنا پر اس کا نام زندہ رہے گا۔ ابوالفضل جو ہمیشہ ہمچوما دیگرے نیست کا نعرہ لگایا کرتا تھا تان سین کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ گذشتہ ہزار سال میں اس جیسا گویا اس سرزمین میں پیدا نہیں ہوا[3]۔ جہانگیر نے بھی اپنی تزک میں تان سین کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا ہے۔

---

[1] سید عابد علی عابد، ماہنامہ قند مردان، موسیقی نمبر بابت مئی جون ۱۹۶۰ء، ص ۸۲۔

[2] خادم محی الدین۔ ایضاً، ص ۱۰۔

[3] ابو الفضل، آئین اکبری، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۷۲ء، ج ۱، ص ۲۶۳۔

تان سین کلاونت کہ در خدمتِ پدرم بے نظیر زمانہ، خود بودہ بلکہ در ہیچ عہد و قرن مغنی مثل او نگذشتہ[۱] ۔

ترجمہ : تان سین کلاونت جو میرے والد کا ملازم تھا اپنے زمانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا ۔ (اپنے زمانے کی تو بات ہی کیا) کسی زمانے میں بھی اس جیسا گویا پیدا نہیں ہوا ۔

تان سین چونکہ مسلمان تھا اور اس نے ہندوستانی موسیقی میں کچھ تصرفات بھی کیے تھے اور اس پر طرہ یہ کہ اس نے موسیقی کو ذریعہ معاش بنا لیا تھا ، اس لیے ہندو اس سے ناخوش تھے ۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ تان سین ہندوؤں کی موسیقی کے زوال کا سبب بنا تھا[۲] ۔

بابا رام داس کے بیٹے سور داس نے بھی فن موسیقی میں بڑا نام پایا تھا ۔ اسے دھرپد اور خیال گانے میں بڑی مہارت حاصل تھی ۔ ایک روایت کے مطابق بشن پد اسی کی ایجاد ہے[۳] ۔

نبات خان بین نواز کا شمار بھی اکبری دور کے نامور سازندوں میں ہوتا ہے ۔ قیسی رام پوری کا کہنا ہے کہ وہ اپنے دور میں بین نوازی میں عدیم المثال تھا[۴] ۔

سور داس پکھاوجی کا شمار بھی اکبری دور کے نامور اہل فن میں ہوتا ہے ۔ وہ تان سین کا ساتھی تھا اور بسا اوقات اسی کے ساتھ آواز ملا کر گایا کرتا تھا ۔ اکبر کے بعد اس کا تعلق جہانگیر کے دربار سے رہا اور جہانگیر کی رحلت کے بعد وہ شاہجہان کے ملازموں کے زمرہ میں شامل ہو گیا تھا ۔

---

۱ ۔ تزک جہانگیری ، سرسید ایڈیشن ، مطبوعہ علی گڑھ ۱۸۶۴ء ، ص ۲۰۴ ۔

۲ ۔ سٹرینجویز ، دی میوزک آف ہندوستان ، مطبوعہ آکسفورڈ ۱۹۱۴ء ، ص ۸۴ ۔

۳ ۔ عثمان خان قیسی رام پوری ۔ صوت الناقوس ، مخطوطہ رضا لائبریری رام پور ، نمبر موسیقی ۱۷ ، ورق ۸۳ الف ۔

۴ ۔ ایضاً ۔

سیف خان نے اُسے دیکھا تھا ۔ اس کی روایت ہے کہ وہ سو سال سے زیادہ عمر پا کر فوت ہوا[1] ۔

اکبری عہد کے موسیقاروں میں بابا رام داس بیراگی کا بڑا اونچا مقام ہے ۔ بابا جی ایک تارک الدنیا اور متوکل انسان تھے ، اس لیے انہوں نے موسیقی کو ذریعہ معاش نہیں بنایا تھا ۔ ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انہیں فنِ موسیقی پر استادانہ مہارت حاصل تھی[2] ۔

اکبری دور میں ایک ماہر فن ایسا بھی ہو گذرا ہے جس کا نام ہمعصر تاریخوں یا تذکروں میں دیکھنے میں نہیں آیا ۔ یہ ماہرِ فن عنایت اللہ بن میر حاج الہروی ہے جس کی فن موسیقی پر ایک گراں مایہ تصنیف تحفتہ الادوار کا ۵۵ ورق کا قلمی نسخہ "بوڈلین لائبریری آکسفورڈ" میں محفوظ ہے ۔ عنایت اللہ نے یہ کتاب اکبر کے نام معنون کی تھی ۔ تحفتہ الادوار کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے ۔

حمدی بیرون از دائرۂ احصاد سپاسی افزون از احاطہ و استقصا[3] ۔

عہدِ اکبر کے علماء

الناس علی دین ملوکھم کے مصداق اکبر کے مصاحب اور حواری بھی موسیقی میں دلچسپی لینے لگے تھے ۔ اکبری دور کے مشہور مؤرخ ملا عبدالقادر بدایونی اکبر کے پیش امام تھے[4] ۔ اس کے باوجود موسیقی کے بڑے دلدادہ تھے ۔ محمد حسین آزاد بدایونی کے متعلق لکھتے ہیں ، "ملا صاحب خود روکھے سوکھے عالم تھے مگر طبیعت ایسی شگفتہ لائے تھے جو انشاء پردازی

---

[1] ۔ سیف خان ، راگ درپن ، مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ ، نمبر فارسیہ ۱۴ ، ورق ۹۴ ب ۔

[2] ۔ عثمان خان قیسی رامپوری ، صوت الناقوس ، قلمی نسخہ رضا لائبریری رامپور ، نمبر موسیقی ۱۷ ۔ ورق ، ۸۲ب ۔

[3] ۔ زخاؤ ، فہرست مخطوطات فارسی ، ترکی ، ہندوستانی و پشتو مخزونہ بوڈلین لائبریری آکسفورڈ ، مطبوعہ آکسفورڈ ۱۸۸۹ء ، حصہ اول ، ص ۱۰۶۳ ۔

[4] ۔ بدایونی ، منتخب التواریخ ، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۵ء ، ج ۲ ، ص ۲۲۷ ۔

کی جان تھی - باوجود علم و فضل اور مشیخت فقر کے گاتے بجاتے تھے - بین پر بھی ہاتھ دوڑاتے تھے[1]- بدایونی نے منتخب التواریخ میں اپنے اس فن کے متعلق یہ معلومات فراہم کی ہیں -

وقوف در نغمہ ولایت و ہندی و خبری از شطرنج صغیر و کبیر دارد و مشق بین بقدری کردہ[2]-

ترجمہ : میں ہندوستانی اور غیر ملکی نغموں سے بخوبی واقف ہوں ، اس کے علاوہ شطرنج کی چھوٹی بڑی بازی بھی لگا لیتا ہوں اور بین بجانا بھی جانتا ہوں -

اس زمانے میں فنِ موسیقی کو بڑا پاکیزہ فن تصور کیا جاتا تھا یہی وجہ تھی کہ گانے بجانے کا شوق بدایونی کی امامت کے راستے میں حائل نہ ہو سکا - بدایونی تو خیر پھر بھی پیش امام تھے ، اکبر کے صدرالصدور شیخ گدائی کے متعلق مشہور ہے کہ ان کی "طبیعت موزوں تھی ، ہندی گیت اور دوہروں کی لے آپ رکھتے تھے - قوالوں سے گواتے تھے اور اپ بھی گاتے تھے اور اس کے ذوق و شوق میں لٹو تھے اور دیوانے تھے[3]"-

شیخ گدائی کے والد شیخ جالی" سلطان سکندر لودھی کے استاد اور بڑے نغز گو شاعر تھے - شاعری کے ساتھ ساتھ انہیں موسیقی سے بھی بڑا لگؤ تھا - شیخ موصوف کی ایک غزل جس کے ابتدائی شعر درجِ ذیل ہیں ، عہدِ اکبر میں بڑے ذوق و شوق سے گائی جاتی تھی اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انہوں نے خود ہندوستانی راگ میں اس کی لے رکھی تھی ۔

طال شوق الی لقائکم ایہا الغایبون من نظری
روز و شب مونسم خیال شماست فاسئلوا عن خیالکم خبری[4]

---

[1] - محمد حسین آزاد ، دربار اکبری ، مطبوعہ لاہور ۱۹۴۷ء ، ص ۴۲۲ -

[2] - بدایونی ، منتخب التواریخ ، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۹ء ، ج ۳ ، ص ۳۰۴ -

[3] - محمد حسین آزاد - دربار اکبری ، مطبوعہ لاہور ۱۹۴۷ء ، ص ۷۷۳ -

[4] - ایضاً ، ص ۷۷۱ -

ابوالفضل اور فیضی کے والد شیخ مبارک ناگوری علومِ شریعت کے ساتھ ساتھ فنِ موسیقی میں بھی کامل دسترس رکھتے تھے ۔ شیخ مبارک کے ذوقِ موسیقی کا اندازہ بدایونی کی اس تحریر سے لگایا جا سکتا ہے ۔

یکدم بی استماع صوتی و نغمی و سرودی و سازی آرام نمی گرفت[۱]۔

ترجمہ : وہ آواز ، گانے ، راگ اور ساز کے بغیر ایک لمحہ بھی نہیں گزار سکتا تھا ۔

مولانا علم الدین سالک، شیخ مبارک کے بارے میں لکھتے ہیں کہ آسے موسیقی میں بھی یدطولیٰ حاصل تھا ۔ ایک دفعہ اکبر سے اس موضوع پر گفتگو ہوئی ، بادشاہ نے کہا کہ اس لطیف فن کے سلسلے میں ہم سے جو سامان بہم پہنچا ہے وہ کسی اور جگہ نہیں ہے ، کسی دن دکھائیں گے ۔ چنانچہ کچھ عرصہ بعد شیخ منجھو ، میاں تان سین اور دیگر کلاونتوں کو بلا بھیجا اور انہیں کہا کہ وہ شیخ کے گھر جا کر اپنے فن کا مظاہرہ کریں ۔ شیخ نے سب سے سنا ۔ آخر میں میاں تان سین سے مخاطب ہوئے اور کہا ، "شنیدم کہ تو ہم چیزی می توانی گفت" اس پر میاں تان سین نے اپنے کمالِ فن کا مظاہرہ کیا جسے سن کر آپ نے کہا ۔ "ہاں کچھ جانوروں کی طرح بولیاں بول لیتے ہو"[۲]۔ سالک صاحب کے اس بیان کی تصدیق بدایونی کی منتخب التواریخ سے بھی ہو جاتی ہے[۳]۔ اس واقعہ سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ شیخ مبارک کا ذوقِ موسیقی اتنا بلند تھا کہ وہ بڑے سے بڑے گویئے کو بھی خاطر میں نہ لاتے تھے ، وہی تان سین جس کے متعلق ابوالفضل لکھتا ہے کہ گذشتہ ہزار برس میں اس سر زمین میں اس جیسا کوئی گویا پیدا نہیں ہوا اس کے متعلق ابوالفضل کا والد کہتا ہے کہ وہ جانوروں کی طرح بھائیں بھائیں کر لیتا ہے ۔

شیخ مبارک کے ذوقِ موسیقی سے اس کے بیٹوں کو بھی وافر حصہ ملا تھا ، چنانچہ فیضی کے متعلق یہ مشہور ہے کہ وہ موسیقی کا ماہر تھا اور اس

---

۱ ۔ بدایونی ، منتخب التواریخ ، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۹ء ، ج ۳ ، ص ۷۳ ۔

۲ ۔ مولانا علم الدین سالک ، نقوش ، لاہور نمبر ۱۹۶۲ء ، ص ۸ ۔ ۳۶۷ ۔

۳ ۔ بدایونی ، منتخب التواریخ ، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۵ء ، ج ۲ ، ص ۲۶۵ ۔

کے کتب خانہ میں موسیقی پر کتابیں موجود تھی[1]۔ ابوالفضل نے آئین اکبری میں جس طرح موسیقی کے زیر و بم پر بحث کی ہے وہ خود اس کے ماہر فن ہونے کی دلیل ہے۔

قاضی نظام بدخشی کا شمار اکبری دور کے نامور علماء میں ہوتا ہے۔ بدایونی کے مطابق بدخشان اور ماوراء النہر میں ان سے بڑا کوئی عالم نہ تھا۔ اکبر نے ان کا پاس ادب کرتے ہوئے انہیں سہ ہزاری منصب پر فائز کیا تھا۔ قاضی صاحب علوم شریعت کے علاوہ فنِ موسیقی سے بھی بہرہ ور تھے[2]۔

ملا قاسم کاہی اکبری دور کے ایک عالم و فاضل بزرگ تھے۔ صاحبِ طبقاتِ اکبری نے ان کے علم و فضل کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے[3]۔ بدایونی کی رائے میں ان کے ہمعصروں میں شعر و شاعری میں ان کا کوئی مدِ مقابل نظر نہیں آتا۔ شاعری کے علاوہ انہیں تفسیر، ہیئت، کلام اور تصوف پر بھی کامل عبور حاصل تھا۔ ملا قاسم کاہی کو موسیقی سے بھی ایک خاص لگاؤ تھا اور اس فن میں انہوں نے کافی کچھ لکھا تھا[4]۔

شاہ فتح اللہ شیرازی کا شمار اکبری دور کے اجل علماء میں ہوتا ہے۔ ان کے متعلق ابو الفضل لکھتا ہے "کہ اگر دنیا سے علم و فن کی تمام کتابیں نابود ہو جائیں تو شاہ فتح اللہ اپنے حافظہ سے علم و فن کی ایک نئی عمارت کھڑی کر دیں[5]"۔ شاہ صاحب کو علومِ شریعت پر کامل عبور ہونے کے ساتھ ساتھ موسیقی میں بھی بڑی دسترس تھی۔ انہوں نے "سوتی خان" نامی ایک ساز بھی ایجاد کیا تھا جو ابراہیم عادل شاہ والی بیجاپور کو بیحد مرغوب تھا[6]۔ اسی ساز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ابراہیم عادل شاہ لکھتا ہے[7]۔

---

۱ - شبلی نعمانی، شعر العجم، مطبوعہ ظفر بکڈپو لاہور، ج ۳، ص ۴۱ -

۲ - بدایونی، منتخب التواریخ۔ مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۵ء، ج ۲، ص ۱۸۳ -

۳ - نظام الدین احمد، طبقاتِ اکبری، مطبوعہ کلکتہ ۱۹۳۱ء، ج ۲، ص ۴۸۵ -

۴ - بدایونی، منتخب التواریخ - مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۹ء، ج ۳، ص ۱۷۳ -

۵ - ابوالفضل، اکبر نامہ، مطبوعہ کلکتہ، ۱۸۸۶ء، ج ۳، ص ۴۰۱ -

۶ - محمد اسلم، شاہ فتح اللہ شیرازی، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۳ء، ص ۶ -

۷ - ابراہیم عادل شاہ، کتاب نورس، مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۵۵ء، ص ۸۷ -

جھنن جھنن جھن موتی خاں کی تانت گاجے
تال بر دنگ بھید سوں نورس باجے

"موتی خان" کے متعلق ہمیں ابراہیم عادل شاہ کی ایک تحریر سے یہ معلوم ہوا ہے کہ اس کی شکل و صورت طنبورہ جیسی تھی[۱]۔ شاہ فتح اللہ دکن میں قریباً سولہ سال رہ کر اکبر کے دربار میں آئے تھے۔ اس لئے اس بات کا قوی امکان ہے کہ وہ دکن کی موسیقی کے اثرات بھی اپنے ساتھ شمالی ہندوستان میں لائے ہوں گے۔

اکبر کے درباری علماء میں سے صرف مولانا عبداللہ سلطان پوری ہی ایک شخص تھے، جنھیں موسیقی سے سخت نفرت تھی اور انھوں نے "قالع البدعتہ" کے عنوان سے ایک رسالہ تحریر فرمایا تھا، جس میں بربط، طنبورہ اور دیگر آلات موسیقی کے استعمال کو حرام قرار دیا تھا[۲]۔

اکبری دور کے مشائخ

علاء الدولہ سمنانی (٦٨٦ - ٧٣٦ھ) کی اولاد سے ایک بزرگ شیخ میر عور بھکر (سندھ) میں مقیم تھے۔ انھیں فن موسیقی کے ساتھ بڑا لگاؤ تھا۔ عبدالباقی نہاوندی ان کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں:

> در علم موسیقی مہارت تمام داشتہ و بغایت لطیف گو بودہ[۳]۔

ترجمہ: وہ علم موسیقی پر بڑی دسترس رکھتے تھے اور بڑا اچھا گانے والے تھے۔

شیخ داؤد کرمانی کا شمار عہد اکبر کے نامور مشائخ میں ہوتا تھا۔ ان کے کشف و کرامت کا شہرہ دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ مؤرخ شہیر عبدالقادر بدایونی ان کے مرید اور حضرت شاہ ابوالمعالی قادری لاہوریؒ ان

---

[۱] ۔ ایضاً، ص ۱۳۹۔
[۲] ۔ عبداللہ سلطان پوری، قالع البدعتہ، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری نمبر شیرانی ۲۱۶۶، ورق ۱۸ ب۔
[۳] ۔ عبدالباقی نہاوندی، مآثر رحیمی، مطبوعہ کلکتہ ۱۹۲۵ء، ج ۲، ص ۳۳۶۔

کے بھتیجے اور خلیفہ تھے ۔ شیخ داؤد کرمانیؒ اکثر سماع سے لطف اندوز ہوا کرتے تھے ۔ اکبری دور کے نامور مؤرخ نظام الدین احمد انھیں ۔ ”صاحبِ ذوق و سماع و وجد و ذکر“ لکھتے ہیں ۔[1]

شیخ محمد کنبو سنبھلیؒ (م ۹۸۵ھ) کا شمار عہد اکبر کے ان صوفیائے کرام میں ہوتا ہے جن کے مجاہدہ اور کشف و کرامت کا شہرہ اطراف و اکناف میں پھیلا ہوا تھا ۔ بدایونی ان کے بارے میں لکھتا ہے :

از سلسلہ قادریہ در ابتدائی حال ریاضت و مجاہدہ بسیار کشیدہ ، صاحبِ ذوق و وجد بود و آواز خوش داشت و در اوقاتی کہ حال برو غالب میکرد ، سرودی میگفت کہ حاضران را برقت می آورد[2] ۔

ترجمہ : آپ قادریہ سلسلہ سے وابستہ تھے ، ابتدائے سلوک میں انھوں نے بڑی ریاضت اور مجاہدہ کیا تھا ۔ آپ صاحب ذوق و وجد تھے اور بڑی اچھی آواز پائی تھی ۔ جب ان پر حال طاری ہوتا تو گانے لگتے جسے سن کر حاضرین پر رقت طاری ہو جاتی ۔

اتفاق سے ایک بار بدایونی نے بھی ان کی محفلِ سماع میں شرکت کی اور خود ان سے گانا سنا تھا ۔ جب بدایونی منتخب التواریخ لکھنے بیٹھا تو ہنوز اس گانے کی لذت باقی تھی[3] ۔

شیخ فخر الدین اکبری دور کے ایک مرتاض بزرگ تھے ، انھوں نے لوگوں سے ملنا جلنا ترک کرکے خلوت اختیار کر لی تھی ۔ آپ ہفتہ میں صرف ایک بار جمعہ کے دن اپنی خانقاہ کا دروازہ عوام کے لیے کھولتے تھے ۔ اس دن آپ بڑے اہتمام کے ساتھ مجلس سماع منعقد کرتے تھے ۔ بدایونی کا بیان ہے کہ خواہ کوئی سماع کا کتنا ہی منکر ہوتا ، ان کی مجلس میں اس پر بھی حال طاری

---

[1] ۱ - نظام الدین احمد ، طبقات اکبری ، مطبوعہ کلکتہ ۱۹۳۱ء ، ج ۲ ، ص ۳-۴ ۔

[2] ۲ - بدایونی ، منتخب التواریخ ، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۹ء ، ج ۳ ، ص ۸-۷ ۔

[3] ۳ - ایضاً ، ص ۸ ۔

ہو جاتا تھا ۔ سماع کے دوران جب شیخ خود وجد میں آتے تو حاضرین بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہتے ۔ جب مجلس سماع برخاست ہوتی تو خدام دستر خوان بچھاتے اور شاہ و گدا مل کر کھانا کھاتے تھے[1] ۔

شیخ محمد غوث گوالیاریؒ کے خلفاء میں سے ایک بزرگ شیخ جلال کالپی میں مقیم تھے ۔ ان کے معتقدین کا حلقہ بہت وسیع تھا اور اکبر اعظم بھی ان سے بڑی عقیدت رکھتا تھا ۔ موصوف سماع میں بڑی دلچسپی لیتے تھے ۔ بدایونی نے ان کے ذوق و شوق کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے ، "در ذوق سماع و وجد و حالت استغراق عظیم داشت[2]" ۔ شیخ جلال کے فرزند شیخ جمیل کو بھی اپنے والد سے ذوق سماع کا وافر حصہ ملا تھا ۔ بدایونی ان کے بارے میں کہتا ہے ۔ "از سماع و سرود ذوقِ تمام داشت[3]" ۔

شیخ عزیز اللہ (م ۹۹۵ھ) کا شمار بھی اکبری دور کے نامور مشائخ میں ہوتا تھا ۔ بدایونی نے اپنی تاریخ میں ان کی تعریفوں کے پل باندھے ہیں ۔ شیخ موصوف سماع میں بڑی دلچسپی لیتے تھے ۔ بدایونی کے مطابق انہوں نے وجد و سماع کو ہی اپنا وظیفہ بنا لیا تھا[4] ۔

اکبر کو شیخ سلیم چشتی کے ساتھ بےحد عقیدت تھی اور اسی عقیدت کی بنا پر اس نے فتح پور سیکری کو اپنا دارالحکومت بنا لیا تھا ۔ شیخِ موصوف کو سماع سے بڑا لگاؤ تھا ۔ ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اپنے مرض الموت میں تان سین کو طلب کر کے اس سے گانا سنا تھا[5] ۔ شیخ سلیم چشتی کا ذوقِ سماع ان کی اولاد کو بھی تفویض ہوا ۔ ان کا پوتا اسلام خان جب جہانگیر کے عہد میں بنگال کا صوبہ دار ہوا تو اس کی سرکار میں اسی ہزار روپیہ

---

[1] ۔ ایضاً ۔

[2] ۔ ایضاً ، ص ۱۳۹ ۔

[3] ۔ ایضاً ، ص ۲۱۳ ۔

[4] ۔ ایضاً ، ص ۱۰ ۔

[5] ۔ محمد حسین آزاد ، دربار اکبری ، مطبوعہ لاہور ۱۹۳۹ء ، ص ۷۹۵ ۔

ماہوار راگ اور رقص کے طائفوں پر صرف کیا جاتا تھا[1] ۔

اکبری عہد کے شعراء

فیروزہ کابلی کا شمار عہد اکبر کے شعراء میں ہوتا ہے ۔ وہ اکبر کے سوتیلے بھائی حکیم میرزا کا درباری شاعر تھا ۔ میرزا کی وفات کے بعد وہ ہندوستان چلا آیا تھا ۔ شاعری کے ساتھ اسے موسیقی سے بھی ایک گونا لگاؤ تھا اور وہ طنبورہ بجانے میں بڑی مہارت رکھتا تھا[2] ۔

خان کلاں میر محمد خان المتخلص بہ غزنوی ترکی اور فارسی کا قادرالکلام اور صاحب دیوان شاعر تھا ۔ شاعری کے علاوہ اسے موسیقی پر بھی کامل دسترس تھی ۔ بدایونی لکھتا ہے کہ خان کلاں کی مجلس میں فضلاء اور شعراء موجود رہتے تھے اور ہر وقت دلنشین ، حلاوت بخش اور طرب افزا تانیں بلند ہوتی رہتی تھیں[3] ۔

اکبر کے امراء

اکبر کا اتالیق بیرم خان موسیقی کا بڑا دلدادہ تھا ۔ عبدالباقی کا خیال ہے کہ اُسے علماء فضلاء اور گوشہ نشین بزرگوں کی صحبت بے حد مرغوب تھی اور اس کی مجلس میں ”جوانان سرو قد ، سیم اندام، لالہ عذار“ ناچ اور گانے پر مامور تھے[4] ۔

بیرم خان اس فن کے ماہرین کی جو قدر کرتا تھا اس کی ایک مثال محمد حسین آزاد نے دربار اکبری میں نقل کی ہے ۔ آزاد لکھتا ہے کہ رام داس لکھنوی سلیم شاہی زمانہ کا گویا تھا اور موسیقی میں دوسرا تان سین کہلاتا تھا ۔ وہ اس کے دربار میں آیا اور گایا ۔ اگرچہ خزانہ میں اس وقت

---

۱ ۔ ابو الکلام آزاد ، غبار خاطر ، مطبوعہ انارکلی کتاب گھر لاہور، ص ۲۸۶ ۔

۲ ۔ بدایونی ، منتخب التواریخ ، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۹ء ج ۳ ، ص ۲۹۷-۹۸ ۔

۳ ۔ شاہنواز خان ، مآثر الامراء ، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۹۱ء ، ج ۳ ، ص ۲۱۵ ۔

۴ ۔ عبدالباقی ، مآثر رحیمی ، مطبوعہ کلکتہ ۱۹۲۵ء ج ۲ ، ص ۴ - ۵۳ ۔

کچھ نہ تھا، پھر بھی لاکھ روپیہ دیا ۔ جب وہ گاتا تھا تو خانخاناں کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے تھے ۔ ایک جلسہ میں نقد جنس اور جو اسباب موجود تھا سب دے دیا اور آپ الگ اٹھ گیا[1] ۔

عبدالباقی نہاوندی نے بیرم خان کے سوانح حیات میں ایک واقعہ کا تذکرہ کیا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں کہ جب خان مذکور افغانوں کی قید سے خلاصی پا کر آگرہ کی طرف روانہ ہوا تو اثنائے سفر اس کا گزر ایک ایسی جگہ ہوا جہاں گنواروں کا ایک گروہ شراب کے نشہ میں بدمست ناچنے گانے میں مشغول تھا ۔ جب بیرم خان ان کے قریب پہنچا تو انہوں نے آسے بھی اپنے ساتھ ناچنے اور گانے پر مجبور کیا ۔ بیرم خان موقع کی نزاکت کا اندازہ لگاتے ہوئے ان کے رقص میں شریک ہوگیا اور ان کے ساتھ آواز ملا کر تنک فلکم ، تنک فلکم کے بول دہرانے لگا[2] ۔

عبدالرحیم خانخاناں کا شمار اکبری دور کے نامور فضلاء میں ہوتا ہے ۔ خان خاناں دیگر علوم کے ساتھ فن موسیقی سے بھی بہرہ یاب تھا ۔ عبدالباقی کے خیال میں اسے ہندوستانی موسیقی پر کامل عبور حاصل تھا اور بڑے بڑے ماہر موسیقار اس فن میں اس کے مشوروں کے محتاج رہتے تھے ۔ ان دنوں یہ بات ملک کے طول و عرض میں مشہور تھی کہ جتنی مہارت اس فن میں خانخاناں کو حاصل ہے اتنی کسی دوسرے شخص کو نہیں[3] ۔

خانخاناں کے دربار کو علم و ادب اور فن موسیقی کا گہوارہ کہنا بیجا نہ ہوگا ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ایک طرح کی "میوزک اکیڈمی" قائم کی ہوئی تھی جہاں ماہرین فن خانخاناں کی دریا دلی اور سرپرستی کی بدولت فکر معاش سے بے نیاز ہو کر فن کی خدمت میں ہمہ تن مصروف رہتے تھے ۔

---

[1] محمد حسین آزاد ، دربار اکبری ، مطبوعہ لاہور ۱۹۴۷ء ، ص ۱۹۳ ۔

[2] عبدالباقی ، مآثر رحیمی ، مطبوعہ کلکتہ ۱۹۲۵ء ، ج ۲ ، ص ۱۴-۱۵ ۔

[3] عبدالباقی ، مآثر رحیمی ، مطبوعہ کلکتہ ۱۹۲۵ء ، ج ۲ ، ص ۱ - ۵۹۰ ۔

مولانا اصولی، جن کا شمار اکبری دور کے نامور موسیقاروں میں ہوتا ہے، تبریز کے رہنے والے تھے - وہ تبریز سے ترکِ سکونت کر کے قزوین چلے آئے جہاں انھوں نے متعدد دھنیں مرتب کیں جو ان کی شہرت کا باعث بنیں - کچھ عرصہ بعد مولانا اصولی قزوین سے ہندوستان چلے آئے - خانخانان ان دنوں گجرات میں مقیم تھے ، یہ وہیں ان کی خدمت میں باریاب ہوئے - خانخانان نے انھیں اپنی سرکار میں ملازم رکھ لیا - عبدالباقی نے لکھا ہے کہ مولانا اصولی خانخانان کو ہمیشہ تازہ ترین نغمات سنایا کرتے تھے - پانچ سال خانخانان کے دربار میں رہنے کے بعد یہ ماہر فن راہیٔ ملک بقا ہوا[1] -

جن فن کاروں نے خان خانان کی ملازمت میں رہ کر بڑا نام پایا ان میں علی بیگ اصفہانی بھی شامل ہے - اسے شاعری اور موسیقی دونوں پر بڑی قدرت حاصل تھی - عبدالباقی لکھتا ہے کہ اس کی مرتب کردہ دھنوں کو بجانا بڑا مشکل تھا اس کے باوجود اس کی بعض دھنیں بڑی مقبول ہوئیں - گانے کے علاوہ علی بیگ کو کمانچہ بجانے میں بھی بڑا کمال حاصل تھا[2] -

استاد میرزا علی بھی خانخانان کی سرکار میں ملازم تھا - عبدالباقی کا کہنا ہے کہ فن موسیقی میں اس کا وہی مقام ہے جو بو علی سینا اور فارابی کا ہے - جب وہ کمانچہ بجاتا تو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی شخص دل پر ناخن سے خراشیں لگا رہا ہو - استاد قبچکی سالہا سال تک خانخانان کے ہاں رہا - بعد ازاں وہ ایران چلا گیا - جہاں شاہ عباس نے اس کی قدر دانی اور عزت افزائی میں کوئی کسر باقی اٹھا نہ رکھی - عبدالباقی ہی کا کہنا ہے کہ ایک بار شاہ عباس نے اسے سونے کے عوض تلوایا تھا[3] -

حافظ تاج شیرازی ایک درویش وضع اور صوفی مشرب انسان تھا اور اسے فن موسیقی پر کامل دسترس تھی - عبدالباقی کی روایت کے مطابق وہ بیس برس

---

۱ - ایضاً ، ج ۳ ، مطبوعہ کلکتہ ۱۹۳۱ء ، ص ۱۶۹۱ -

۲ - ایضاً ، ص ۱۰۰۱ - ۱۶۶۹ -

۳ - ایضاً ، ص ۱۶۹۴-۹۵ -

تک خان خانان کے دربار سے وابستہ رہا اور "نیکی و نیک ذاتی و خوش خوانی" میں اس کی نظیر ملنا مشکل تھی[۱] -

طہاس قلی ورساق خانخاناں کا درباری موسیقار تھا اور ترکی زبان میں گانا گانے میں اس کا کوئی ہمسر نہ تھا ۔ عبدالباقی کا کہنا ہے کہ اس کا شمار فن موسیقی کے یگانہ روزگار ماہرین میں ہوتا تھا[۲] -

حافظ شیرہ ہرات کا رہنے والا تھا اور اس کا نام خراسان کے گویوں میں سرفہرست تھا - وہ ہرات سے ترک سکونت کر کے ہندوستان چلا آیا جہاں خانخاناں نے اسے مال و دولت سے نوازا[۳] -

خانخاناں کے حضور میں رہ کر جن لوگوں کے کمال فن کا شہرہ چار دانگ علم میں پھیلا ، ان میں محمد مومن طنبورہ نواز بھی شامل ہے - عبدالباقی لکھتے ہیں کہ شاہ عباس کے دربار میں آقا رضا نامی ایک طنبورہ نواز تھا ، جس کی نظیر متقدمین اور متأخرین میں نہیں ملتی - محمد مومن اسی امام فن کا شاگرد تھا - محمد مومن ابھی کمسن ہی تھا کہ شاہ عباس کے میر آخور محمد قلی کو اس کی آواز پسند آ گئی - اس نے اسے اپنی فرزندی میں لے کر اس کی تربیت شروع کر دی اور جب وہ کسی قابل ہوا تو اسے شاہ عباس کے حضور میں پیش کیا - شاہ نے اس کے فن کا مظاہرہ دیکھ کر اسے آقا رضا کے سپرد کیا جس کی شاگردی نے محمد مومن کے فن کو مزید جلا بخشی -

ایک بار محمد قلی جب ایک اہم سفارتی مشن پر استرا باد جانے لگا تو وہ محمد مومن کو بھی اپنے ہمراہ لے گیا - اثنائے سفر گنبد قابوس کے نواح میں کسی شخص نے محمد قلی پر قاتلانہ حملہ کیا - محمد قلی اس حملہ سے جانبر نہ ہو سکا اور اس کی وصیت کے مطابق اس کا تمام مال و اسباب محمد مومن کے حصہ میں آیا - محمد مومن اپنے مربی کی وفات کے بعد شاہ عباس کے دربار میں چلا آیا -

---

۱ - ایضاً ، ص ۱۶۹۶-۹۷ -

۲ - ایضاً ، ص ۱۶۹۶ -

۳ - ایضاً -

کچھ عرصہ بعد وہ حج کے ارادے سے حجاز چلا گیا ، لیکن فریضۂ حج کی ادائیگی کے بعد ایران جانے کی بجائے ہندوستان چلا آیا جہاں خانخاناں نے اسے اپنی سرکار میں ملازم رکھ لیا ۔

محمد مومن صبح و شام خانخاناں کو اپنے نغمات سے محظوظ کیا کرتا تھا ۔ چند سال ہندوستان میں قیام کے بعد وہ اصفہان چلا گیا ۔ عبدالباقی نہاوندی لکھتا ہے کہ محمد مومن سے اس کی ملاقات اصفہان میں ہوئی تھی اور وہ خانخاناں کی سخاوت اور دریا دلی کا بڑا متعرف تھا[1]۔

آقا محمد نامی ابتداء میں شاہ عباس کے دربار سے منسلک تھا ۔ اس کے متعلق مشہور ہے کہ اسے اپنی زبان پر قابو نہ تھا اس لیے شاہ عباس نے ناراض ہوکر اسے ملک بدر کر دیا ۔ نامی بندر ہرمز سے جہاز میں سوار ہوکر ہندوستان پہنچا اور یہاں آتے ہی یہ رباعی لکھ کر خانخاناں کی خدمت میں پیش کی ۔

نامی چہل سال در جہاں گردیدم
بسیار ز شاہ و شہریاران دیدم
در ہمت و در شجاعت و در مردمی
نامردم اگر جز خان خاناں دیدم

خانخاناں نے ازرہ قدردانی آسے اپنے ہاں ملازم رکھ لیا ۔ اس نے خانخاناں کے نام سے متعدد ترکی اور عراقی دھنیں مرتب کیں ۔ کچھ عرصہ بعد نامی بیجاپور چلا گیا اور حسبِ سابق وہاں سے بھی نکالا گیا ۔ ۱۰۲۳ھ میں جب عبدالباقی حج کو جاتے ہوئے ٹھٹہ میں رکا تو اس کی ملاقات نامی سے ہوئی اور مہمان کی تواضع کی خاطر نامی نے چند نغمات پیش کیے ۔ کچھ عرصہ بعد نامی دوبارہ ہندوستان چلا آیا اور شہزادہ خرم کے توسط سے جہانگیر کے حضور میں باریاب ہوا ۔ جہانگیر نے ایک بار اس کے کمالِ فن کا اعتراف کرتے ہوئے اسے سونے کے برابر تلوایا اور "عشرت خاں" کے خطاب سے سرفراز کیا[2]۔

---

۱ - ایضاً - ص ۱۶۹۵ -

۲ - ایضاً - ص ۹۰ - ۱۶۹۸ء -

باز بہادر مالوہ کا حاکم اور فن موسیقی میں یکتائے روزگار تھا ۔ اس نے موسیقی کی تعلیم سلطان عادل شاہ سوری سے پائی تھی اور اس فن میں اس کی مہارت مسلمہ ہے ۔ نورالحق محدث دہلوی باز بہادر کے متعلق لکھتے ہیں ۔

> باز بہادر در اقسامِ سرود ہندی بی نظیر وقت بود[١]۔

> ترجمہ : باز بہادر ہندوستانی موسیقی میں یگانۂ روزگار تھا ۔

جب باز بہادر تخت نشین ہوا تو افغان سرداروں نے یہ خیال کرتے ہوئے کہ اسے تو گانے بجانے ہی سے فرصت نہیں ملتی اس کی ریاست پر چڑھائی کر دی ۔ دولت خان اجین سے اور مصطفٰی خان نولائی سے فوجیں لے کر مانڈو کی طرف بڑھے ۔ باز بہادر نے ان کے حملے کی اطلاع پاتے ہی طاؤس و رباب کو خیر باد کہا اور ان کے مقابلہ کو نکلا ۔ فریقین میں گھمسان کا رن پڑا ، جس میں دولت خان گرفتار ہو کر قتل ہوا اور مصطفٰی خان نے بھاگ کر گونڈوانہ میں رانی درگاوتی کے ہاں پناہ لی ۔ باز بہادر اس کے تعاقب میں گونڈوانہ کی حدود میں جا داخل ہوا ۔ رانی درگاوتی نے باز بہادر کے متوقع حملہ کے پیش نظر سپاہیوں کی ایک بڑی تعداد پہاڑی دروں میں متعین کر دی ۔ ایک روز جب باز بہادر کا لشکر ایک پہاڑی درے سے گذر رہا تھا تو رانی درگاوتی کے سپاہیوں نے اچانک اس پر حملہ کر دیا ۔ باز بہادر اور اس کے سپاہیوں نے بھاگ کر بمشکل جانیں بچائیں ۔ باز بہادر گونڈوانہ سے جان بچا کر سارنگ پور پہنچا تو شکست کا غم مٹانے کے لیے گانے بجانے میں مشغول ہو کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا ۔

مؤرخ شہیر فرشتہ باز بہادر کے موسیقی میں انہاک کے متعلق لکھتا ہے ۔

درفنِ موسیقیٔ ہندوستان مہارت تمام داشت مدار بر صحبت زنان مغنیہ

---

١ ۔ نورالحق ، زبدۃ التواریخ ، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری ، آذر کلشن نمبر 11/8 ، ورق ٣١١ ب ۔

نہاد[1]۔

ترجمہ : آسے ہندوستانی موسیقی پر کامل عبور تھا اور گانے والی عورتوں کی صحبت بڑی مرغوب تھی ۔

باز بہادر نے گانے کی ایک نئی طرز ایجاد کی تھی جو اس کے نام کی مناسبت سے "باز خانی طرز" کہلاتی ہے[2]۔ علامی ابوالفضل نے باز بہادر کا ذکر بھی اکبر کے درباری موسیقاروں کے زمرہ میں کیا ہے[3]۔

خنجر بیگ چغتائی اکبر کا درباری امیر تھا ۔ بقول بدایونی وہ خطاطی شاعری، معما ، اصطرلاب ، نجوم اور دانش میں "یگانہ عہد" تھا[4]۔ نظام الدین احمد نے ان علوم کی فہرست میں حکمت کو بھی اضافہ کیا ہے[5]۔ اُسے موسیقی پر بھی کامل دسترس تھی اور وہ ہر قسم کے فارسی نغموں اور ہندی راگوں سے واقف تھا ۔ بدایونی کا کہنا ہے کہ اس عہد میں اس کی نظیر ملنا مشکل تھی[6]۔

مہیش داس ، جو تاریخ میں راجہ بیربل کے نام سے مشہور ہے ، اکبر کا ندیم خاص تھا ۔ وہ ہندی زبان کا شاعر ہونے کے علاوہ موسیقی پر کامل عبور رکھتا تھا[7]۔

زین خان کا شمار عہدِ اکبر کے نامور امراء میں ہوتا ہے ۔ اکبر نے اس کی ماں پیچہ جان کا دودھ پیا تھا ، اس رشتے سے وہ اکبر اعظم کا رضائی بھائی

---

۱ - نعمت اللہ ہروی ، تاریخ خان جہانی - مطبوعہ ڈھاکہ ۱۹۶۰ء ، ج ۱ ، ص ۶ - ۳۰۵ -

۲ - محمد نواب علی خان ، معارف النغمات ، مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۱۳ء ، ص ۱۸ -

۳ - ابوالفضل ، آئین اکبری - مطبوعہ کلکتہ ۱۸۷۲ء ج ۱ ، ص ۲۶۳ -

۴ - بدایونی ، منتخب التواریخ ، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۹ ، ج ۳ ، ص ۲۲۴ -

۵ - نظام الدین احمد ، طبقات اکبری ، مطبوعہ کلکتہ - ۱۹۳۱ء ، ج ۲ ص ۴۴۷ -

۶ - بدایونی ، منتخب التواریخ ، مطبوعہ کلکتہ - ۱۸۶۹ء ج ۳ ، ص ۲۲۴ -

۷ - شاہنواز خان ، مآثرالامراء ، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۹۰ء ، ج ۲ ، ص ۱۲۲ - ۱۱۸ -

بھی تھا[1]۔ اُسے شاعری اور موسیقی سے ایک خاص لگاؤ تھا[2]۔ بدایونی اس کے بارے میں لکھتا ہے کہ مختلف اقسام کے ہندوستانی ساز اور دف بجانے میں وہ اپنا ثانی نہ رکھتا تھا[3]۔

مرزا غازی بیگ ٹھٹھہ کا حاکم اور اکبر کا منصب دار تھا۔ اُسے اہل علم کی صحبت بہت پسند تھی۔ کبھی کبھار وہ شعر بھی کہہ لیتا تھا اور وقارلی تخلص کرتا تھا۔ غازی بیگ کو موسیقی سے بھی خاص لگاؤ تھا۔ شاہنواز خان نے لکھا ہے کہ اس فن میں اس کا کوئی مدِمقابل نہ تھا، یوں تو وہ ہر قسم کا ساز بجا لیتا تھا لیکن طنبورہ نوازی میں وہ یگانۂ عہد تھا[4]۔

اکبر کے عہد میں یعقوب نام کا ایک عیسائی تاجر حلب سے بسلسلۂ تجارت آگرہ آیا۔ وہ کئی زبانوں کا ماہر تھا۔ پرتگیزوں کے ساتھ مذہبی مذاکرات کے سلسلہ میں اکبر کو فارسی اور پرتگیزی زبانیں جاننے والے مترجم کی ضرورت تھی، چنانچہ اکبر نے یعقوب کو ملازم رکھ لیا۔ یہ کہا جاتا ہے کہ یعقوب نے دینِ الٰہی قبول کر لیا تھا۔ یعقوب کی وفات کے بعد اکبر نے اس کے نوعمر بیٹوں، ذوالقرنین اور سکندر کی تربیت اپنی نگرانی میں کی اور اول الذکر کو موسیقی کی تعلیم دلوائی۔ ذوالقرنین کو موسیقی پر مکمل دسترس تھی اور وہ جہانگیر اور شاہجہان کے دربار میں اساتذۂ فن کی موجودگی میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا کرتا تھا[5]۔ شاہنواز خان نے بھی ذوالقرنین کو بحیثیت موسیقار خراجِ عقیدت پیش کیا تھا۔

اکبر کے بیٹوں میں سے دانیال نے بھی موسیقی کا ذوق پایا تھا۔ محمد حسین آزاد نے لکھا ہے کہ وہ گانے کا شوقین تھا اور کبھی کبھار خود بھی ہندی دوہڑے کہتا تھا[6]۔

---

[1] ایضاً، ص ۳۶۲ -
[2] ایضاً، ص ۳۶۹ ۔
[3] بدایونی، منتخب التواریخ، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۹ء، ج ۳، ص ۲۳۵ -
[4] شاہنواز خان، مآثرالامراء، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۹۱ء، ج ۲، ص ۳۴۷ -
[5] ہیگ، ٹی ڈبلیو، انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، آرٹیکل: تان سین -
[6] محمد حسین آزاد، دربار اکبری، مطبوعہ لاہور - ۱۹۴۷ء، ص ۱۱۱ -

اکبری عہد میں موسیقی کے مراکز

اکبر کے عہد میں گوالیار فنِ موسیقی کا بڑا مرکز سمجھا جاتا تھا۔ وہاں راجہ مان سنگھ تنوار نے ایک اکیڈمی قائم کی تھی، جس میں نائک بخشو جیسا عدیم المثال ماہر فنِ موسیقی کی تعلیم دینے پر مامور تھا۔ نائک بخشو دھرپد کا بڑا ماہر تصور کیا جاتا تھا اور شمالی ہندوستان کے موسیقاروں پر اس کا اثر شاہ جہان کے عہد تک غالب رہا[۱]۔ مان سنگھ تنوار، نائک بخشو، سلطان عادل شاہ سوری اور حضرت محمد غوث گوالیاری کی توجہ سے گوالیار کا شمار موسیقی کے اہم مراکز میں ہونے لگا تھا۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ اکبر کے دربار کے اٹھارہ میں سے گیارہ گویوں کا تعلق گوالیار ہی سے تھا۔

ابوالفضل آئین اکبری میں بلگرام کے بارے میں لکھتا ہے کہ وہاں کے باشندے اپنی فہم و فراست میں مشہور اور موسیقی کے دلدادہ ہیں[۲]۔

مشرقی پنجاب میں تلونڈی موسیقی کا گہوارہ سمجھا جاتا تھا اور اس قصبہ کی خاک سے بڑے بڑے ماہرین فن پیدا ہوئے، جنھوں نے موسیقی کی نوک پلک سنوارنے اور اسے عروج پر پہنچانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ رحیم داد خان، جس نے اکبر کے پوتوں کو موسیقی کے زیر و بم سے متعارف کرایا تھا، تلونڈی ہی کا رہنے والا تھا[۳]۔

جس روز دل کی بات مغنی سمجھ گیا
سمجھو تمام مرحلہ ہائے ہنر ہیں طے
(اقبال)

۱۔ عبدالحلیم، ایسیزآن ہسٹری آف انڈو پاک میوزک۔ مطبوعہ ڈھاکہ ۱۹۶۲ء ص ۳۲ - ۳۱ -

۲۔ ابوالفضل، آئین اکبری۔ مطبوعہ کلکتہ ۱۸۷۲ء، ج ۱، ص ۴۳۲ -

۳۔ آغا صادق۔ ماہنامہ قند مردان، موسیقی نمبر مئی، جون ۱۹۶۰ء، ص ۶۱ -

جہانگیر کا ذوقِ موسیقی

جہانگیر بھی اپنے باپ کی طرح موسیقی کی سرپرستی کرتا رہا ۔ اس کے دربار میں اُستاد محمد نائی ، شوق طنبورہ نواز ، باقیا ، جہانگیر داد ، چتر خان، حافظ عبداللہ ، حافظ ناد علی ، نصیرا ، حافظ چیلہ ، حافظ کیب فتحا ، رحیم داد خان ، پرویز داد ، خرم داد ، ماکھو اور حمزہ جیسے نادر روزگار ماہرین موسیقی موجود تھے ۔ ان میں سے اکثر کے کمال فن کا اعتراف اس نے اپنی تزک میں کیا ہے ۔ جہانگیر اُستاد محمد نائی کا بڑا قدر دان تھا ۔ ایک موقع پر وہ اس کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے ۔

اوستاد محمد نائی را کہ در فنِ خود از بے نظیران بود، فرزند خرم بموجب طلب فرستادہ بود ، چند مجلس ساز ازو شنیدہ شد و نقشی کہ در غزل بنام من بستہ بود گذرانید ، در روز دہم ماہ مذکور فرمودم کہ او را بروپیہ وزن نمودند ، شش ہزار و سیصد روپیہ و فیل حوضہ داری نیز باو عنایت نمودہ ، مقرر فرمودم کہ برآن فیل سوار شدہ روپیہا براطراف و جوانب خود چیدہ و پاشیدہ بمنزل خود برد[1] ۔

ترجمہ : اُستاد محمد نے نواز کو ، جو اپنے فن میں یکتا تھا ، میرے کہنے پر خرم نے میرے پاس بھیج دیا ۔ چند مجلسوں میں میں نے اُس سے ساز سنا اور اس نے جس غزل کی لے میرے نام سے تیار کی تھی ، اس کا بھی مظاہرہ کیا ۔ ماہ مذکور کی بارہ تاریخ کو میں نے حکم دیا کہ اسے روپوں کے برابر تولا جائے ۔ چھ ہزار تین سو روپے اور ایک ہاتھی معہ ہودج اُسے عنایت کیا ۔ میں نے اُسے حکم دیا کہ وہ اس ہاتھی پر سوار ہوکر اپنے گھر جائے اور راستے میں دونوں طرف روپے پیسے برساتا جائے ۔

---

[1] تزک جہانگیری ، سرسید ایڈیشن ، مطبوعہ علی گڑھ ۱۸۶۴ء ، ص ۱۸۶ ۔

اکبر نے بھی بڑی دریا دلی کے ساتھ موسیقاروں کی سرپرستی کی تھی ، لیکن جس انداز سے جہانگیر نے ایک نے نواز کو نوازا تھا اس کی مثال عہدِ اکبر میں دیکھنے میں نہیں آتی - جہانگیر شوق طنبورہ نواز کے کمال فن کا بھی بڑا معترف تھا ، اس نے اپنی تزک میں آسے ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا ہے -

شوق طنبورہ نواز را کہ از نادر ہائے روزگار است و نغمات ہندی و پارسی را بروشی مینوازد کہ زنگ از دلہا زواید بخطاب آنند خانی دلخوش و مسرور ساختم ، آنند بزبان ہندی خوشی و راحت را می گویند[1] -

ترجمہ : شوق طنبورہ نواز کو، جو زمانے بھر میں اپنے فن میں یکتا ہونے کے علاوہ ہندوستانی اور ایرانی نغمات اس انداز سے گاتا ہے کہ انھیں سن کر دلوں کا زنگ اتر جاتا ہے ، میں نے آنند خان کا خطاب دے کر خوش اور مسرور کیا - ہندی زبان میں آنند ، خوشی اور راحت کو کہتے ہیں -

معتمد خان نے اقبال نامہ جہانگیری میں دربارِ جہانگیر کے تیرہ موسیقاروں کا ذکر کیا ہے جو اپنے اپنے فن میں یکتائے روزگار تھے[2] - جہانگیر کے درباری موسیقاروں میں رحیم داد خان کا بڑا اونچا مقام تھا ، وہ تلونڈی کا رہنے والا اور اپنے فن کا امام مانا جاتا تھا - جہانگیر کے حکم سے اس نے شہزادوں کو موسیقی کے زیر و بم سے متعارف کروایا تھا[3] -

اکبر کے عہد میں یعقوب نام کا ایک عیسائی تاجر حلب سے بسلسلۂ تجارت آگرہ آیا - وہ کئی زبانوں کا ماہر تھا - پرتگیزوں کے ساتھ مذہبی مذاکرات کے سلسلہ میں اکبر کو فارسی اور پرتگیزی زبانیں جاننے والے مترجم کی ضرورت تھی ، چنانچہ اکبر نے یعقوب کو ملازم رکھ لیا ، روایت ہے کہ یعقوب نے دین الٰہی قبول کر لیا تھا - یعقوب کی وفات کے بعد اکبر نے اس کے نو عمر بیٹوں ، ذوالقرنین اور سکندر کی تربیت اپنی نگرانی میں کی

---

۱ - ایضاً ، ص ۱۶۲ -

۲ - اقبال نامہ جہانگیری ، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۵ء ، ص ۳۰۸ -

۳ - آغا صادق ، ماہنامہ قند مردان، موسیقی نمبر مئی جون ۱۹۶۰ء ، ص ۶۱ -

اور اول الذکر کو موسیقی کی تعلیم دلائی۔ ذوالقرنین کو موسیقی پر مکمل دسترس حاصل تھی اور وہ جہانگیر اور بعد ازاں شاہجہان کے دربار میں اساتذۂ فن کی موجودگی میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا کرتا تھا[1]۔ شاہنواز خان نے بھی ذوالقرنین کو بحیثیت موسیقار خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

عہدِ جہانگیر میں ٹھٹھہ کا گورنر عیسیٰ خان ترخان بھی موسیقی کا بڑا اونچا ذوق رکھتا تھا[2]۔
شاہنواز خان اس کے متعلق لکھتا ہے:

دل دادہ راگ و رنگ بود، و در نغمہ خوانی و ساز نوازی خالی از کمال نبود[3]۔

ترجمہ: وہ راگ رنگ کا دلدادہ تھا، راگ گانے اور ساز بجانے میں بھی بڑا کمال رکھتا تھا۔

عہدِ اکبر کی طرح عہد جہانگیر میں بھی شاہی تقریبات اور جشنوں کے موقع پر گوئیے اور سازندے پیش پیش ہوتے تھے۔ جہانگیر نے اپنی تخت نشینی کے بعد جب پہلا نوروز منایا[9] تو نوروز کی تقریبات میں اہل ساز و نغمہ نے اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کیا تھا[4]۔ جہانگیر نے اپنی تزک میں گیارھویں سال جلوس میں نوروز کے موقعہ پر حافظ ناد علی کو انعام دینے کا ذکر کیا ہے[5]۔

---

۱ - ڈاکٹر عبدالحلیم، ایسیز آن ہسٹری آف انڈو پاک میوزک، مطبوعہ ڈھاکہ ۱۹۶۲ء، ص ۳۱-۳۲۔

۲ - مرأت آفتاب نما، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری، ورق ۲۹۶ ب۔

۳ - شاہنواز خان، مآثرالامرأ، جلد ۳، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۹۱ء، ص ۴۹۲۔

۴ - تزک جہانگیری، سرسید ایڈیشن، مطبوعہ علی گڑھ ۱۸۶۴ء، ص ۲۲۔

۵ - ایضاً، ص ۱۵۵۔

سولھویں سال جلوس میں جب جہانگیرطویل علالت کے بعد صحت یاب ہوا تو نور جہاں نے اس خوشی میں ایک جشن آراستہ کیا جس میں اہلِ نشاط موجود تھے[1] ۔

جہانگیر قوالی کا بھی دلدادہ تھا اور اس کی مجلس سماع میں صوفیان باصفا کو وجد آ جاتا تھا ۔ ایک بار دہلی کے قوال اس کے حضور میں قوالی پیش کر رہے تھے اور جب انھوں نے امیر خسروؒ کا یہ شعر پڑھا :

ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے
من قبلہ راست کردم برسمت کج کلاہے

تو ملا علی احمد مہرکن کو وجد آ گیا ۔ اُنھوں نے بھی اپنی ٹوپی ذرا ترچھی کر لی اور تڑپ کر زمین پر گرے ، جہانگیر نے لپک کر ان کا سر اُٹھایا تو ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی تھی[2] ۔

بادی النظر میں یوں معلوم ہوتا ہے کہ اکبر کے مرنے کے ساتھ ہی موسیقی کو زوال آ گیا تھا اور شاہجہان کی زر پاشیوں کی بدولت اسے دوبارہ عروج ہوا ، لیکن یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ جن گویوں نے شاہجہان کے عہد میں نام پایا ان کی تربیت جہانگیر کے عہد میں ہوئی تھی، اس لیے جہانگیر کے دور کو فن موسیقی کے زوال کا دور نہیں کہا جا سکتا ۔ اب رہا یہ اعتراض کہ جہانگیر کا دور اگر موسیقی کے زوال کا دور نہیں تھا تو پھر اس عہد کے تذکروں میں موسیقاروں کا ذکر زیادہ کیوں نہیں ملتا ۔ اس کا سیدھا سا جواب یہ ہے کہ اکبر کے ساتھ اس کے درباری گوئیے تو نہیں مر گئے تھے ، اس لیے جن گویوں کا ذکر اکبر کے عہد کی تاریخوں اور تذکروں میں آ چکا تھا ، اسے عہد جہانگیری میں دہرانا مناسب نہیں سمجھا گیا ۔ اسی طرح جو گوئیے عہد جہانگیر میں ابھی مبتدی تھے اور اُنھوں نے عہدِ شاہجہان میں بھی شہرت پائی ان کا ذکر عہد شاہجہان میں لکھی جانے والی تاریخوں میں آیا ہے ۔

---

[1] ۱ - ایضاً ، ص ۳۳۵ ۔

[2] ۲ - ایضاً ، ص ۸۲ ۔

شاہجہان کا ذوقِ موسیقی

شاہجہان اپنے آبا وُ اجداد کے تمام اوصاف حمیدہ سے متصف تھا اور اس کے دل میں علمی ذوق ہر وقت موجزن رہتا تھا ، لیکن اس کا حسن ذوق علم و ادب یا تزک نویسی کی بجائے جامع مسجد دہلی کی ندرت اور نفاست میں ظاہر ہوا ۔ ایک ماہر فن کے بقول اس نے محبت کا نغمہ شعر و شاعری میں نہیں بلکہ تاج محل میں منظوم کیا ۔ اس کے تمام ہم عصر مؤرخ اس بات پر متفق ہیں کہ اس نے زندگی بھر نماز با جماعت اور تہجد قضا نہیں کی ، لیکن اس علم و فضل اور نیکی و تقویٰ کے باوجود وہ فن موسیقی کی سرپرستی میں اپنے باپ اور دادا سے بھی آگے بڑھا ہوا تھا ۔

سرجدو ناتھ سرکار اپنی تصنیف ”سٹڈیز ان مغل انڈیا“ میں رقمطراز ہے کہ شاہجہان کی اپنی آواز بڑی سریلی تھی اور خدا تعالٰی نے اُسے لحن داؤدی عطا کیا تھا ، جب وہ بات کرتا تو سننے والے بت بن جاتے تھے[1] ۔ اسی ضمن میں مؤرخ شہیر ایشوری پرشاد لکھتا ہے کہ بادشاہ نے خود کئی ہندی راگ ایجاد کیے تھے ، جو اس قدر مدہوش کن اور دلکش تھے کہ سماع کی محفلوں میں صوفیان باصفا انہیں سن کر گھنٹوں وجد کے عالم میں رہتے تھے[2] ۔

پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں ”قواعد السلطنت شاہجہان“ نام کی ایک کتاب موجود ہے جو بہادر شاہ ظفر کے بیٹے مرزا فتح الملک بہادر کے کتب خانہ میں رہ چکی ہے ۔ اس کا مصنف لکھتا ہے کہ شہنشاہِ معظم کو ایرانی، کشمیری اور ہندوستانی راگ راگنیوں سے خاص لگاؤ تھا اور وہ بسا اوقات نصف شب تک ان سے محظوظ ہوا کرتے تھے[3] ۔ سرجدو ناتھ سرکار کی تحقیق کے مطابق

---

[1] سرجدو ناتھ سرکار ، سٹڈیزان مغل انڈیا، مطبوعہ کلکتہ ۱۹۱۹ء ، ص ۱۳۔

[2] ایشوری پرشاد ، اے شارٹ ہسٹری آف مسلم رول ِان انڈیا ، مطبوعہ الہ آباد ۱۹۳۰ء ، ص ۷۶۶ ۔

[3] قواعد السلطنت شاہجہان ، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی ، ورق ۱۴ ب ۔

شاہجہان رات کے ساڑھے آٹھ بجے حرم میں چلا جاتا اور وہاں دو تین گھنٹے تک موسیقی سے لطف اندوز ہوتا رہتا تھا[1]۔ عہدِ حاضر میں شاہجہان کا مشہور سوانح نگار بنارسی پرشاد سکسینہ لکھتا ہے کہ بادشاہ سلامت امورِ سلطنت سے فارغ ہو کر تکان دور کرنے کے لیے غروب آفتاب سے قبل موسیقی سے محظوظ ہوا کرتے تھے اور معمول کے مطابق رات کو سونے سے پیشتر بھی سماع سنتے تھے۔ رات کی محفلوں میں عام طور پر گانے بجانے پر کنیزیں مامور تھیں۔ اس کے علاوہ شاہی دربار میں بھی خاص جشنوں کے موقع پر راگ رنگ کا پروگرام پیش کیا جاتا تھا، جس میں اساتذۂ فن حصہ لیتے تھے[2]۔

اسی ضمن میں شاہجہان کا ایک ہم عصر مؤرخ امین قزوینی رقمطراز ہے بادشاہ اکثر اوقات ساز و نغمہ سے جی بہلاتا ہے۔ اُسے ہندی نغمات کے ساتھ ایک خصوصی لگاؤ ہے اور جو اس فن سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ انہیں موسیقی سے زیادہ اور کسی چیز میں لذت محسوس نہیں ہوتی۔ ہندوستانی موسیقی پر بادشاہ کی بڑی گہری نظر ہے اور اس کے علاوہ ایرانی اور غیر ملکی موسیقی سے وہ بڑی حد تک واقف ہے۔ اس ضمن میں اس بات کا ذکر بیجانہ ہوگا کہ دوسرے ممالک کے لوگ نغمہ و لحن پر زیادہ زور دیتے ہیں لیکن ہندوستانی نزاکت اور معانی کے قدردان ہیں۔ بادشاہ عموماً نماز مغرب کے بعد موسیقی سنتا ہے اور مجلس موسیقی برخاست کرکے نماز عشاء باجماعت ادا کرتا ہے[3]۔

نائک بخشو کو فوت ہوئے ایک زمانہ گزر چکا تھا لیکن شاہجہان کو اس کے کمالِ فن کا اعتراف تھا۔ اس خیال سے کہ کہیں وقت گذرنے کے ساتھ اس نادرِ روزگار موسیقار کا فن بھی ختم نہ ہو جائے شاہجہان نے ماہرین فن کو مامور کیا کہ وہ بخشو کے گائے ہوئے دھرپد جمع کریں۔ انہوں نے

---

۱ - سٹڈیز ان مغل انڈیا، ص ۱۳ -

۲ - بنارسی پرشاد سکسینہ، ہسٹری آف شاہجہان آف دہلی، مطبوعہ الہ آباد ۱۹۶۲ء، ص ۳۳۷ -

۳ - قزوینی، پادشاہنامہ، مخطوطہ برٹش میوزیم لندن، اورینٹل ۱۷۳، ورق ۱۴۱ ب -

شب و روز کی محنت شاقہ کے بعد "ہزار دھرپد نائک بخشو" کے نام سے ایک کتاب مرتب کر کے بادشاہ کی خدمت میں پیش کی۔ حسن اتفاق سے یہ کتاب زمانہ کی دست برد سے بچ کر بوڈلین لائبریری آکسفورڈ میں محفوظ ہے[1]۔ شاہجہان کے عہد کے اکثر گویوں کا مدار بخشو کی تصانیف پر تھا۔ اس حقیقت کا اعتراف شاہجہان کے درباری مؤرخ عبدالحمید لاہوری نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

> امروز مدار خنیا گران ہندوستان بہشت نشان برتصانیف بخشو و تصانیف اوست[2] ۔

> ترجمہ : آج کل ہندوستان بہشت نشان کے گویوں کا دارو مدار نائک بخشو اور اس کی تصانیف پر ہے۔

پادشاہنامہ میں قزوینی نے بھی بخشو نائک کو دل کھول کر خراج تحسین پیش کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ اس دور میں بخشو کی طرز خاص و عام میں مقبول ہے تاہم یہ ماننا پڑے گا کہ اس جیسی— صورت و صدا و حسن و ادا— کے ساتھ کوئی نہیں گا سکتا[3] ۔ اس بات کا اعتراف عبدالحمید لاہوری نے بھی کیا ہے کہ عہد شاہجہان میں بخشو جیسی ٹیپ دوسرے نغمہ سرا ادا نہیں کر سکتے[4] ۔

شاہجہان کے ذوق موسیقی کا اندازہ اس سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ لال قلعہ کے نوبت خانہ میں گوئیے موجود رہتے تھے جو دن کے پہروں کو

---

[1] - زخاؤ اینڈ ایتھے ، فہرست مخطوطات فارسیہ و ترکیہ وغیرہ ، جلد اول ، مطبوعہ آکسفورڈ ۱۸۸۹ء ، مخطوطہ فارسی ۱۸۴۶ -

[2] - عبدالحمید لاہوری ، بادشاہ نامہ ، جلد دوم ، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۷۲ء ، ص ۷ -

[3] - محمد امین قزوینی ، پادشاہنامہ ، مخطوطہ برٹش میوزیم لندن، اوریئنٹل ۱۷۳، ورق ۳۳۰ ب -

[4] - بادشاہنامہ ، جلد ۲ ، ص ٦ -

راگوں اور راگنیوں کے ذریعے بتایا کرتے تھے ۔ شاہجہان کے عہد حکومت میں شادی بیاہ کی تقریبات اور درباری جشن بڑے تزک و احتشام سے منعقد ہوتے تھے ۔ بادشاہ کی تخت نشینی کی سالگرہ، جشن نوروز، جشن وزن قمری جشن وزن شمسی کے موقعوں پر جو تقریبات منعقد ہوا کرتی تھیں ان میں موسیقی کے پروگرام خصوصیت کے ساتھ پیش کیے جاتے تھے ۔

محمد صالح کنبوہ ۱۰۴۲ھ کے واقعات کے ضمن میں رقمطراز ہے کہ جب شہزادہ داراشکوہ کا عقد شہزادہ پرویز کی بیٹی نادرہ بیگم سے ہوا تو اس موقع پر "مطربان ہفت کشور" موجود تھے اور انھوں نے اپنے فن کا بہترین مظاہرہ کیا[1] ۔ اس جشن کی تفصیل ذرا قزوینی کی زبانی سنیے ۔

جشنے عظیم بود و آواز خوش و آہنگ دلکش مطربان و خنیا گران ہوش از سر ناہید می ربود[2] ۔

ترجمہ : یہ بڑا عظیم جشن تھا ۔ سازندوں اور گویوں کی دلکش اور سریلی آواز نے ناہید ستارے کے بھی ہوش اڑا دیے تھے ۔

داراشکوہ کے عقد کے چند روز بعد ہی شہزادہ شجاع کی شادی رستم میرزا صفوی کی بیٹی کے ساتھ ہوئی تو اس موقعہ پر آتشبازی کا بہترین مظاہرہ ہوا اور مشہور و معروف گویوں نے موسیقی کا رنگا رنگ پروگرام پیش کیا[3] ۔ لطف کی بات یہ ہے کہ جب ۱۰۴۶ھ میں شاہجہان نے اپنے ولی صفت بیٹے اورنگ زیب رح کا عقد شاہنواز خان کی بیٹی دلرس بانو سے کیا تو اس تقریب پر موسیقاروں نے موسیقی کا ایسا عمدہ پروگرام پیش کیا کہ بقول عبدالحمید لاہوری آسمان والوں نے کئی روز تک زمین سے سوائے نغمات کے اور کوئی آواز نہیں سنی[4] ۔ اس کے اصل الفاظ یہ ہیں :

---

۱ ۔ شاہجہان نامہ، جلد اول، مطبوعہ لاہور ۔ ۱۹۶۰ء، ص ۴۰۶ ۔

۲ ۔ پادشاہ نامہ، ورق ۲۶۰ الف ۔

۳ ۔ شاہجہان نامہ، جلد دوم، ص ۴۱۴ ۔

۴ ۔ بادشاہنامہ، جلد اول، ص ۲۶۸ ۔

"از نغمه و ساز مطربان سحر پرداز عیش و طرب را روز بازاری و سرور و انبساط را سروکاری دیگر شد ، بگوش آسمانیان جز صدای کامرانی نمی رسید و سامعهٔ زمینیان جز آوای شادمانی نمی شنید" ۔

۱۰۳۴ھ میں جب شہزادی جہاں آراء نے غسل صحت کیا تو اس خوشی میں ایک شاہانہ جشن منایا گیا جس پر بلا مبالغہ لاکھوں روپیہ صرف ہوا ، اس موقع پر تمام گویوں اور موسیقاروں کو خلعت عطا کئے گئے اور نقد انعام سے بھی نوازا گیا ۔ عبدالحمید لاہوری نے خصوصیت کے ساتھ لعل خان کلاونت اور اس کے بیٹوں کا ذکر کیا ہے ، جنھیں دو ہزار روپے مرحمت ہوئے تھے[1]۔

شاہجہان کے عہد میں دکن ، کرناٹک ، تلونڈی اور گوالیار موسیقی کے بڑے مرکز تسلیم کئے جاتے تھے ، اکبر کے دربار کے اکثر و بیشتر گوئیے گوالیار سے ہی آئے تھے ، شاہجہان کے درباری گویوں کی اکثریت بھی گوالیار کی ہی رہنے والی تھی ۔ اودھ میں باگرام موسیقی کا گہوارہ سمجھا جاتا تھا ۔ ابوالفضل نے آئین اکبری میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ بلگرام کے باشندے اپنی فہم و فراست میں مشہور اور موسیقی کے دلدادہ ہیں[2]۔ مشرقی پنجاب میں تلونڈی موسیقی کا گہوارہ سمجھا جاتا تھا اور اس قصبہ کی خاک سے بڑے بڑے ماہرین فن پیدا ہوئے جنھوں نے موسیقی کی نوک پلک سنوارنے اور اسے عروج پر پہنچانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا ۔ رحیم داد خان جس نے جہانگیر کے حکم سے شہزادوں کو موسیقی کے زیر و بم سے متعارف کروایا تھا ، تلونڈی ہی کا رہنے والا تھا[3]۔

سیف خان رقمطراز ہے کہ شاہجہان کی تخت نشینی کے بعد ہی قلمرو موسیقی کی تخت گاہ گوالیار سے بہت سے فن کار شاہی دربار میں چلے آئے اور ان میں سے اکثر فنکار موسیقی کی جدید دھنوں اور گوالیار کی نئی بندشوں اور ترکیبوں سے بخوبی آگاہ تھے ۔ اس طرح مغلوں کے دربار میں ایرانی موسیقی

---

۱ ۔ ایضاً ، ص ۳۰۰ ۔

۲ ۔ آئین اکبری ، جلد اول ، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۷۲ء ، ص ۴۳۲ ۔

۳ ۔ آغا صادق ، ماہنامہ قند مردان ، موسیقی نمبر مئی جون ۱۹۶۰ء ، ص ۶۱

کے ساتھ ہندوستانی موسیقی بھی جگہ حاصل کر لینے میں کامیاب ہو گئی ۔ اکبر کے زمانۂ اقتدار میں ہی ہندوستانی موسیقی کو کافی اونچا مقام مل گیا تھا ۔ ہندی اور ایرانی موسیقی کے اختلاط سے ایک نیا فن پیدا ہو رہا تھا جس میں ایرانی ترکیبوں اور ہندوستانی بندشوں نے مل کر دلکشی پیدا کر دی تھی ۔ شاہجہان نے کشمیری دھنیں بھی اس میں شامل کر کے ایک نیا مکتب موسیقی قائم کیا[۱] ۔

الناس علی دین ملوکھم کے مصداق شاہجہان کی دیکھا دیکھی اس کے درباری امراء بھی موسیقی میں دلچسپی لینے لگے ۔ صاحبِ مآثر الامرأ شاہنواز خان صفوی کے متعلق لکھتا ہے :

ہم دل دادۂ راگ و نغمہ ، خوانندہ و سازندہ کہ نزد او فراہم آمدہ بودند در ہیچ سرکارے درانوقت نبود[۲] ۔

ترجمہ : وہ راگ و نغمہ کا دلدادہ تھا ، اور جتنے گوئیے اور سازندے اس نے اپنے ہاں جمع کیے تھے ، اتنے اس زمانے میں کسی دوسرے کے پاس نہ تھے ۔

اسی تذکرہ نویس نے شاہجہان کے ایک درباری امیر حسام الدین خان کے سوانح حیات مرتب کرتے وقت اس بات کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا ہے ۔

در فنِ موسیقی بسیار ماہر خوش محاورہ بد یہہ گوئی سخندان بود[۳] ۔

ترجمہ : وہ فن موسیقی میں مہارت رکھنے کے علاوہ اپنی خوش کلامی اور حاضر جوابی کے لیے بھی مشہور تھے ۔

یہی تذکرہ نگار زین خان کوکہ کے فرزند مغل خان کے متعلق لکھتا ہے ۔

---

۱ - محمد اسلم ، شاہجہان کا ذوقِ موسیقی ، امروز سنڈے ایڈیشن ۱۹ مارچ ۱۹۶۸ء ، ص ۷ ۔

۲ - شاہنواز خان ، مآثر الامراء ، جلد دوم مطبوعہ کلکتہ ۱۸۹۰ء ، ص ۶۷۵ ۔

۳ - ایضاً ، جلد اول ، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۸۸ء ، ص ۵۸۶ ۔

شکار دوست بود و بنغمہ و سرود شیفتگی داشت ، سازندہ و نوازندہ بسیار فراہم آورد[1]۔

ترجمہ : وہ شکار کے علاوہ نغمہ و سرود کا بھی بڑا دلدادہ تھا اور اس نے بہت سے گوئیے اور سازندے جمع کر لیے تھے ۔

بدھ سنگھ ہاڈہ راجہ بوندی کا فرزند "شاہزادہ مکرم و معظم" کا مصاحب تھا اور کابل میں رہتا تھا - اس کے متعلق شاہ نواز خان رقمطراز ہے ۔

در اقسامِ نغمہ قدرت تمام داشت[2]۔

ترجمہ : وہ نغمہ کی مختلف اقسام پر کامل دسترس رکھتا تھا ۔

شاہجہان کے درباری امراء میں ذوالقرنین فرنگی بھی اپنے ذوق موسیقی کی وجہ سے بڑا مشہور تھا ، اس کا ذکر اس کتاب میں جہانگیر کے عہد میں ہو چکا ہے -

راجہ روزِ افزوں کا بیٹا عیدے سنگھ بھی موسیقی کا بڑا ماہر تسلیم کیا جاتا تھا ۔ شاہجہان نے اسے دولت افزوق کا خطاب عطا کیا تھا ۔ اساتذۂ موسیقی کا یہ کہنا ہے کہ وہ امیر خسروؒ اور سلطان حسین شرقی کے علم و فن میں بڑی دسترس رکھتا اور خیال و ترانہ خوب گاتا تھا[3]۔

شاہجہاں کے درباری اُمرأء میں سیف خان بلاشبہ سب سے بڑا موسیقی دان تھا اور اُس نے اس فن پر—راگ درپن—کے نام سے ایک قابلِ قدر کتاب بھی تالیف کی ہے - اس کے مخطوطے پنجاب یونیورسٹی لائبریری ، مولانا

---

۱ - ایضاً ، جلد سوم ، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۹۱ء ص ۴۹۲ -

۲ - مرآت آفتاب نما ، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری ، ورق ۲۹۶ -

۳ - اکرام امام خان ، معدن موسیقی ، مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۲۵ء ، ص ۲۸ -
سیف خان نے اس کا نام عدیل سنگھ لکھا ہے ، جو صحیح معلوم ہوتا ہے (راگ درپن ورق ۴۷) -

آزاد لائبریری علی گڑھ ، پیر محمد شاہ لائبریری احمد آباد اور انڈیا آفس لائبریری لندن میں موجود ہیں اور ان میں سے اول الذکر تینوں مخطوطے راقم السطور کی نظر سے گذر چکے ہیں ۔ راگ درپن حال ہی میں پروفیسر نورالحسن انصاری کی سعی و کاوش سے دہلی سے شائع ہوگئی ہے ۔ یہ وہی سیف خان ہے ، جس کے متعلق ناصر علی سرہندی نے کہا تھا ۔

گفتگوئے طوطی از آئینہ می خیزد علے
گر نباشد سیف خان ما را نفس درکار نیست[1]

اسی سیف خان کے متعلق شاہنواز خان لکھتا ہے ۔

ہمواره در حضور پادشاہی دولت بار می افروخت و بدوام روشناسی خود را در خور نوازش می ساخت[2]۔

ترجمہ : وہ ہر وقت بادشاہ کے حضور میں رہتا تھا اور اسی حضورِ دوام کی وجہ سے انعام و اکرام سے سرفراز ہوتا رہتا تھا ۔

ایک دوسرے موقع پر شاہ نواز خان نے اس کے کمالِ فن کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے :

در فن راگ و نغمہ بسیار ماہر بود[2]۔

ترجمہ : وہ راگ و نغمہ کے فن میں بڑی مہارت رکھتا تھا ۔

اس کی تالیف راگ درپن ۔ بذاتِ خود سیف خان کے ماہرِ موسیقی ہونے پر دال ہے ۔ سیف خاں کا مقبرہ قلعہ بہادر گڈھ پٹیالہ کے عقب میں تا حال موجود ہے ۔

شاہی دربار کے علاوہ صوفیائے کرام کی خانقاہیں بھی اس دور میں موسیقی کا گہوارہ بن گئی تھیں ۔ عہدِ شاہجہان میں قادریہ سلسلہ کی ترویج کے ساتھ سماع کو بھی فروغ ہوا اور اس سلسلہ کے بزرگوں نے دل کھول کر گویوں کی سرپرستی کی ۔ قادری بزرگوں کے علاوہ شطاریہ سلسلہ کے درویشوں نے بھی

---

۱ ۔ دیوان ناصر علی سرہندی ، مطبوعہ نظامی پریس دہلی ۱۲۹۲ھ ، ص ۲۲ ۔

۲ ۔ مآثرالامراء ، جلد ۲ ، ص ۲۸۰ ۔

موسیقی کی ترویج و ترقی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس جگہ ایک شطاری بزرگ شیخ پیر کا ذکر بیجا نہ ہوگا جو عہدِ شاہجہان میں میرٹھ میں رہتے تھے۔ انھیں قدرت نے ذوقِ موسیقی ودیعت کیا تھا اور ان کی خانقاہ میں ہر وقت شعر و نغمہ کی محفل جمی رہتی تھی۔ شاید اسی سبب سے ان کے ہمعصر مؤرخ انہیں سبب رونقِ ارباب غنا، کہتے تھے[۱]۔ طبقاتِ شاہجہانی کا مؤلف ان کے متعلق رقمطراز ہے:

بوجد و سماع میلانِ خاطر عظیم داشت و نقشہائے ہندی می بست و عرسہائے بزرگان خود می کردہ و مجلس ہا عالی برپا نمود و نقشہائے وی تاثیر عجب دارد[۲]۔

ترجمہ: وجد و سماع کی طرف ان کا میلان بہت زیادہ تھا اور وہ خود بھی ہندی راگ ترتیب دیا کرتے تھے۔ وہ اپنے بزرگوں کے عرس مناتے اور اس موقع پر بڑی بڑی مجالس منعقد کرتے۔ ان کے مرتب کردہ راگوں میں ایک عجب اثر ہوتا تھا۔

شیخ پیر میرٹھی کے انتقال پر محمد صادق نے یہ تاریخ کہی تھی[۳]۔

گفت تاریخ وفاتش، خود دور اندیش
وہ کہ از مردن وی بی سر و پا شد نغمہ

اگر نغمہ کے سر اور پاؤں یعنی "ن" اور "ہ" حذف کر دئے جائیں تو "غم" باقی رہ جاتا ہے اور حروف ابجد کے حساب سے اس کے عدد ۱۰۴۰ ہوتے ہیں اور یہی ان کا سالِ وفات ہے۔

راگ درپن میں سیف خان نے عہدِ شاہجہان کے جن ۳۳ موسیقاروں کا ذکر کیا ہے ان میں صوفی بہاءالدین سرفہرست ہیں۔ آپ جھنجھانہ کے ایک قریبی گاؤں برناوہ کے رہنے والے تھے، لیکن سیر و سیاحت کا شوق انھیں

---

[۱] ۔ ایضاً، ص ۴۸۴ ۔

[۲] ۔ محمد صادق، طبقات شاہجہانی، مخطوطہ برٹش میوزیم لندن، اورینٹل ۱۶۷۳، ورق ۳۱۲ ب ۔

[۳] ۔ ایضاً ۔

اوائل عمر میں ہی دکن لے گیا۔ وہاں آپ نے ۲۵ سال درویشوں کی خدمت میں گذارے اور ان کی صحبت میں رہتے ہوئے خود بھی درویش کامل بن گئے۔ آپ ہمیشہ سبز رنگ کا لباس زیب تن کرتے تھے۔ سیف خان رقمطراز ہے کہ دکن میں رہتے ہوئے آپ نے سنگیت میں کمال حاصل کیا۔ شاہجہان کے دور میں اس فن میں ان کا کوئی ہمسر نہ تھا۔ آپ ترانہ اور خیال بہت اچھا گاتے تھے اور رباب اور بین امرتی بجانے میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ آپ نے — خیال — نامی ایک ساز بھی ایجاد کیا تھا۔ پچاس سال کی عمر میں آپ دکن سے واپس لوٹے اور بقیہ عمر اپنے آبائی وطن میں فقر و تجرد میں گذار دی۔ سیف خان کی روایت کے مطابق آپ نے ۱۱۰ سال کی عمر پائی[1]۔

شیخ شیر محمد اس دور میں ایک نامور موسیقار اور صاحبِ دل درویش ہوئے ہیں۔ ان کی تربیت صوفی بہاءالدین اور شیخ نصیر الدین نے کی تھی۔ شیخ نصیر الدین کی دعا سے انھوں نے نغمہ و سرود میں خوب ترقی کی اور سلطان حسین شرقی کی طرز کو مقبول بنانے میں پوری تندہی سے مصروف رہے۔ سیف خان نے انھیں سنا تھا اور اس کے خیال میں وہ "خیال" خوب گاتے تھے اور اس پر طرہ یہ کہ ان کے گانے میں درد ہوتا تھا۔ شاید اسی وجہ سے وہ درویشوں کی مجالس میں بڑے مقبول تھے۔ وہ خیال کے علاوہ ترانہ اور تکانہ بھی گا لیتے تھے۔ ع

مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی

انھوں نے پٹنہ میں بمرض استسقاً وفات پائی اور اس وقت ان کی عمر پچاس اور ساٹھ سال کے درمیان تھی[2]۔ عنایت خان راسخ شیخ شیر محمد کو اکبر آباد کے رہنے والے بتاتا ہے اور اس کے خیال میں وہ قوالی کے بھی بڑے ماہر تھے اور گاہ گاہے شاہجہان کے حضور میں اس فن کا مظاہرہ کرتے رہتے تھے[3]۔

---

۱ - سیف خان، راگ درپن، مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ، نمبر ۴۱ علوم فارسیہ، ورق ۴۲ ب، ۴۳ الف۔

۲ - ایضاً ورق ۴۳ الف، ۴۳ ب - ۴۴ الف۔

۳ - عنایت خان راسخ، رسالہ ذکر مغنیان ہندوستان، مطبوعہ پٹنہ ۱۹۶۱ء، ص ۳۶ -

میاں ڈالو ڈاڈھی[1] شیخ شیر محمد کے ہم قوم اور اپنے فن میں یکتائے روزگار تھے۔ وہ درویشانہ وضع رکھتے تھے اس لیے اہلِ دولت سے ملنا جلنا انہیں ناپسند تھا۔ سیف خان نے ان کا راگ سن کر یہ کہا تھا۔

در دھرپد خواندن ہمچو او دیگری شنیدہ نشد[2]۔

ترجمہ: ان جیسا دھرپد اور کوئی گویا نہیں گا سکتا۔

سیف خان جیسے فنکار کو بھی اس بات کا اعتراف ہے:

وی سبو ہمچو می نواخت کہ مثل او دیگری دیدہ نشدہ و در ہیچ عصری نشنیدہ[3]۔

ترجمہ: وہ گھڑا بجانے میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے اور کسی دور میں بھی ان جیسا فنکار سننے میں نہیں آیا۔

میاں ڈالو نے اکبر آباد میں ذات الجنب کے مرض سے وفات پائی۔ ان کی عمر کچھ زیادہ نہیں ہوئی۔

شیخ شیر محمد کا بھائی پوجا بھی اچھا گویا تھا وہ بعارضہ بھگندر اکبر آباد میں فوت ہوا۔ وفات کے وقت اس کی عمر پچاس اور ساٹھ سال کے درمیان تھی[4]۔ شیخ شیر محمد کا پوتا معین الدین بھی اپنے آبائی فن میں کامل دسترس رکھتا تھا۔ شاہنواز خان کا بیان ہے کہ وہ خیال بہت اچھا گاتا تھا[5]۔ عنایت خان راسخ نے اسے -- رسالہ ذکر مغنیان ہندوستان -- کی تدوین کے وقت احمد شاہ کے پانچویں سال جلوس میں دیکھا تھا، اس وقت وہ کافی معمر ہو

---

[1] ابوالفضل لکھتا ہے کہ ڈاڈھی پنجابی گویوں کو کہتے ہیں اور وہ ڈھلہ اور کنگرہ بجا کر گاتے ہیں: آئین اکبری، جلد ۲، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۷۵ء، ص ۱۳۲۔

[2] راگ درپن، ورق ۴۲ ب۔

[3] ایضاً۔

[4] ایضاً، ورق ۴۷ الف۔

[5] مرأت آفتاب نما، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری، ورق ۲۹۷ الف۔

چکا تھا ۔ اس کا یہ کہنا ہے کہ اپنے زمانے میں وہ قوالی اور ترانہ گانے میں اپنی مثال آپ تھا[1] ۔

میاں ڈالو ڈاڑھی کا شاگرد رشید شیخ کمال بھی بڑا اچھا گویا تھا ۔ سیف خان کے ساتھ اس کی اکثر صحبت رہتی تھی ۔ ۱۰۷۶ھ میں راگ درپن کی تصنیف کے وقت شیخ کمال بقید حیات تھا ، لیکن نغمہ و سرود سے کنارہ کش ہو کر فوج میں بھرتی ہو چکا تھا[2]۔

کبیر قوال شیخ شیر محمد کا شاگرد تھا اور قوالی کے فن میں اپنے استاد سے بھی گوئے سبقت لے گیا تھا ۔ اس نے قوالی کی ایک نئی طرز وضع کی تھی ۔ شاہی دربار میں بھی اسے بڑی عزت کا مقام حاصل تھا[3]۔ راگ درپن کی تصنیف کے وقت وہ زندہ تھا اور سیف خان کو اکثر راگ اور قوالی سے محظوظ کرتا رہتا تھا[4]۔

باقیائی نائی بڑی اچھی طبیعت کا مالک تھا اور اس نے ہندوستانی اور ایرانی نغموں کو ملا کر ایک نئی طرز نکالی تھی ۔ ماہرین فن کا یہ کہنا ہے کہ باقیائی نائی کے راگ میں بڑی تاثیر تھی ۔ ایک موقع پر اس نے شاہجہان کی مدح میں قصیدہ پڑھا ، جس کے صلہ میں اسے اپنے وزن کے برابر پانچ ہزار روپے ملے[5]۔ سیف خان نے روڑا قوال کے فن کی بھی تعریف کی ہے وہ بھی شاہجہان کے حضور میں قوالی پیش کیا کرتا تھا ۔ شاہ جہان کے عہد میں شیخ شیر محمد ، کبیر ، روڑا اور میر صالح بڑے اونچے پایہ کے قوال تھے اور اس

---

[1] ۔ رسالہ ذکر مغنیان ہندوستان ، ص ۳۶ ۔

[2] ۔ راگ درپن ، ورق ۴۵ ب ۔

[3] ۔ رسالہ ذکر مغنیان ہندوستان : ص ۳۶ ۔

[4] ۔ راگ درپن ، ورق ۴۷ الف ۔

[5] ۔ برہان الدین ، شاہجہان نامہ ، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری آذر کلکشن نمبر ۲۷۶۲ ، ورق ۶۳۰ ب ۔

[6] ۔ راگ درپن ، ورق ۴۷ الف ۔

فن میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ ان کا زیادہ تر وقت درویشوں کی خانقاہوں میں ہی گذرتا تھا، بلکہ حق تو یہ ہے کہ انھیں کے دم قدم سے کئی خانقاہوں کی رونق قائم تھی۔ پیشہ ور گویوں میں سے جہانگیر کا درباری طنبورہ نواز شوقی ہنوز زندہ تھا۔ وہ ہندی اور ایرانی راگ سے کماحقہ واقف تھا۔ جہانگیر نے اپنی تزک میں اور سیف خان نے راگ درپن میں اس کے کمالِ فن کا اعتراف کیا ہے[1]۔

جگن ناتھ کلاونت شاہجہان کا درباری گویا تھا اور دھرپد گانے میں اپنا ثانی نہ رکھتا تھا۔ سیف خان کا کہنا ہے کہ تان سین کے بعد اس جیسا گویا سرزمین ہندوستان میں پیدا ہی نہیں ہوا۔ جب تان سین نے جگن ناتھ کو گاتے ہوئے دیکھا تو بیساختہ کہا کہ اس کے بعد وہ اس فن پر کام کرے گا[2]۔ قزوینی ساتویں سالِ جلوس کے واقعات کے ضمن میں اس کے متعلق لکھتا ہے:

> جگناتھ کلاونت که بخطاب مہاکب رائے نامور است و در ساختن تصنیف ہندی و پیدا کردن معانی بلند و مضامین عالی امروز نظیر نه دارد و بندگان حضرت او را بواسطه بستن تصانیف که ہندیان آنرا درپت گویند در دارالسلطنه لاہور گذاشته بودند سعادتِ اندوز ملازمت گشته و دوازده تصانیف که بنام ہیمون آنحضرت بمضامین تازه در نغمات مختلف ساخته بود بحضور اشرف خواند و پسند خاطر مشکل پسند بادشاه دانش ور نکته دان افتاده و بر حسبِ اشاره علیه او را بزر وزن کرده چهار ہزار و پانصد روپیه که ہم سنگ او بر آمد باو مرحمت فرمودند[3]۔

۱۔ (i) تزک جہانگیری، سرسید ایڈیشن، مطبوعہ علی گڑھ ۱۸۶۴ء، ص ۱۸۶؛
(ii) راگ درپن، ورق ۴۹ ب۔

۲۔ ایضاً، ورق ۴۵ الف۔

۳۔ محمد امین قزوینی، پادشاہنامہ، مخطوطہ برٹش میوزیم لندن، اورینٹل ۱۷۳، ورق ۳۲۹ ب۔

ترجمہ : جگن ناتھ کلاونت ، جو مہاکب رائے کے لقب سے مشہور ہے ، بلند پایہ اور معنی خیز ہندی راگ تصنیف کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ بادشاہ سلامت نے اُسے ہندی راگ ، جنھیں دھرپد کہتے ہیں ، تصنیف کرنے کے لیے لاہور میں چھوڑا ہوا تھا ، حضور میں باریاب ہوا ۔ اس نے وہ بارہ راگ جو بادشاہ کے نام پر مرتب کیے تھے ، حضور میں پیش کیے جو دانشور اور نکتہ ور بادشاہ کی مشکل پسند طبیعت کو پسند آئے ۔ بادشاہ کے حکم سے اُسے روپوؤں کے عوض تولا گیا اور اس کے وزن کے برابر چار ہزار پانچ سو روپے اُسے مرحمت ہوئے ۔

عہد شاہجہان کے تمام مؤرخین نے جگن ناتھ کے کمال فن کا بڑی فراخدلی کے ساتھ اعتراف کیا ہے ۔ یاد رہے کہ یہ وہی "متعصب" شاہجہان ہے جس نے خطۂ بنارس میں ۷۶ مندر مسمار کروا دئے تھے ۔ شاہجہان نے جہاں قاضی محمد اسلم ہرویؒ اور مولانا عبدالحکیم سیالکوٹیؒ جیسے جید اور مستند علماء کو روپوں کے عوض تلوایا تھا ، وہاں اس نے جگن ناتھ جیسے ہندو موسیقی دان کی بھی ویسی ہی عزت افزائی کی ۔ ہمارے خیال میں جہاں تک علم و فن کا تعلق ہے ہندو اور مسلمان دونوں اس کی نظر میں مساوی تھے ۔

مسلمان موسیقاروں میں دربارِ شاہجہان میں لعل خان کلاونت کا بڑا اونچا مرتبہ تھا ۔ لعل خان ابھی نو عمر ہی تھا جب وہ تان سین کی خدمت میں اکتسابِ فیض کی غرض سے حاضر ہوا ۔ تان سین نے کمال توجہ سے اس کی تربیت شروع کی ۔ ابھی یہ نو آموز ہی تھا کہ تان سین کو پیغام اجل آ پہنچا ۔ اس کی وصیت کے مطابق اس کے فرزند بلاس خان نے اُسے اپنی شاگردی میں لے لیا ۔ جب وہ اس فن میں خوب طاق ہو گیا تو بلاس خان نے اپنی بیٹی اس کے حبالۂ نکاح میں دے دی ۔ سیف خان نے اسے اپنے وقت کا سب سے بڑا دھرپد راگی لکھا ہے[1]۔ عبدالحمید لاہوری کے بادشاہ نامہ سے بھی سیف خان

---

[1] ۱ - راگ درپن ، ورق ۴۴ ب ۔

کے بیان کی تصدیق ہوتی ہے[1]۔

شاہجہان کے دربار میں اس کا بڑا عالی رتبہ تھا اور وہ تان سین کی جگہ پر کھڑا ہو کر اپنا راگ پیش کیا کرتا تھا۔ شاہجہان کو چونکہ دھرپد بے حد مرغوب تھا اس لیے وہ لعل خان کی بڑی قدر کیا کرتا تھا اور ہر جشن کے موقع پر اُسے انعام و اکرام سے لاد دیا کرتا تھا۔ عبدالحمید لاہوری کی روایت کے مطابق ایک بار بادشاہ نے اس کا راگ سن کر اُسے گن سمندر کا خطاب اور ایک ہاتھی بطور انعام دیا تھا[2]۔

لعل خان نے ۱۰۶۲ھ میں بعارضہ فالج انتقال کیا۔ بقول سیف خان وفات کے وقت اس کی عمر اسی برس کے لگ بھگ تھی۔

لعل خان کے بیٹے خوشحال خان اور بسرام خان بھی شاہی دربار میں ملازم تھے۔ ان میں سے اول الذکر کا راگ شاہجہان کو بہت پسند تھا۔ لعل خان کے مرنے کے بعد اس کا منصب خوشحال خان کو ملا اور اُسے بھی تان سین کے مقام پر کھڑے ہو کر گانا پیش کرنے کا شرف حاصل تھا[3]۔

عنایت خان راسخ اور شاہنواز خانؒ نے خوشحال خان کے متعلق ایک بڑا ہی دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ مرشد قلی خان دربار سے رخصت چاہتے تھے۔ لیکن شاہجہان کسی طرح بھی اُسے رخصت دینے پر آمادہ نہ تھا۔ مرشد قلی خان نے امیر الامراء کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ کسی خاص موقع پر اس کی درخواست شاہجہان کے حضور میں پیش کر دے گا۔ کئی روز تک یہ دونوں بادشاہ کا موڈ دیکھتے رہے۔ لیکن شاہجہان کا موڈ

---

[1] بادشاہنامہ، جلد ۲، ص ۵ ۔ در عہد سعادت مہد سر آمد نغمہ سرایان ہندوستانی زبان است و در خواندن دھرپد ھای او بروش او عدیل ندارد۔

[2] ایضاً، ص ۳۱۱۔

[3] عنایت خان راسخ، رسالہ ذکر مغنیان ہندوستان، مطبوعہ پٹنہ ۱۹۶۱ء، ص ۳۵۔

ہی درست ہونے میں نہ آتا تھا ۔ بالآخر ان دونوں نے خوشحال خان کو ایک بڑی رقم کا لالچ دے کر بادشاہ کے حضور میں ایک سحر آفرین راگ پیش کرنے پر آمادہ کر لیا ۔ خوشحال خان نے تان سین کے مقام پر کھڑے ہو کر راگ چھیڑا اور جب شاہجہان راگ سننے میں ہمہ تن گوش بنا ہوا تھا، امیر الامراء نے مرشد قلی خان کی عرضی بادشاہ کے حضور میں پیش کرکے اس پر بادشاہ کے دستخط کروالیے ۔ جب بادشاہ ہوش میں آیا اور آسے حقیقت حاصل معلوم ہوئی تو اس نے خوشحال خان کو تان سین کے مقام پر کھڑا ہونے سے منع کر دیا[1] ۔

جگن ناتھ ، لعل خان ، خوشحال خان اور بسرام خان کا ذکر کرتے ہوئے عہد شاہجہان کے مورخوں نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ یہ گوئیے تان سین کے بالواسطہ یا بلا واسطہ شاگرد تھے اور تان سین کی طرز میں خوب گاتے تھے ۔ محمد امین قزوینی اور عبدالحمید لاہوری ، دونوں عہد شاہجہان کے نامور مؤرخ ہیں ۔ ان کا کہنا ہے کہ شاہجہان کے عہد میں تان سین کی طرز خواص و عوام میں بہت مقبول تھی ۔ قزوینی کے الفاظ ہیں :

بالفعل طرز تان سین درمیان مردم متداول است چون مدتہا در خدمت حضرت عرش آشیانی بوده طرز و روش و تصانیف او شیوع تمام یافتہ واکثر کلاونتان این عصر درپت ہائی او را می خوانند و بروش تصنیف می سازند[2] ۔

> ترجمہ : ان دنوں تان سین کی طرز عوام میں کافی مقبول ہے ۔ وہ چونکہ مدت دراز تک اکبر کی خدمت میں رہا تھا اس لیےاس کی طرز ، روش اور تصانیف نے خوب رواج پایا ۔ اس زمانے کے اکثر کلاونت اس کے مرتب کردہ دھرپد گاتے ہیں یا پھر اس کی لے میں خود مرتب کرتے ہیں ۔

---

[1] ۔ ایضاً ، ص ۴۶ ، ۴۵ ، ii ۔ مرآت آفتاب نما ، ورق ۲۹۵ ب ۔

[2] ۔ بادشاہنامہ ، ورق ، ۳۲۰ ب ، ۳۲۱ الف ۔

گن خان کلاونت بھی شاہجہان کا درباری گویا تھا اور بقول سیف خان وہ علم مارگ میں اُستاد تھا ۔ شہزادہ شجاع کو اس کا راگ بے حد مرغوب تھا ، اس لیے اُس نے آسے شاہجہان سے مانگ لیا تھا ۔ گُن خان کی بقیہ عمر بنگال میں شہزادے کی خدمت میں گزری اور وہیں اس کا انتقال ہوا[1] ۔ شہزادہ شجاع کا ایک اور مصاحب مصری خان ، جو پنجاب کا رہنے والا اور بلاس خان کا شاگرد تھا ، اپنے وقت کا بہترین گویا تھا ۔ ۱۰۷۶ھ میں راگ درپن کی تصنیف کے وقت وہ ہنوز زندہ تھا اور اس کی عمر اسی سال سے متجاوز تھی[2] ۔

ہندو گویوں میں سے اکبر کا ایک ہم عصر گویا حمیرسین شاہجہان کے عہد میں قریباً اسی سال کی عمر میں فوت ہوا تھا ۔ سیف خان نے اس کا شمار کلاونتوں کے زمرہ میں کیا ہے ۔ اس کا بیٹا سبل سین عہد شاہجہان کے گنے چنے موسیقاروں میں شمار ہوتا ہے ۔ بقول سیف خان چالیس برس کی عمر میں اس کے تمام دانت نکل گئے تھے اور چند سال بعد عقل بھی جاتی رہی تھی ۔ شاہجہان کے عہد حکومت میں ہی پچاس سال کی عمر میں وہ رام جی کو پیارا ہوا[3] ۔

ایشوری پرشاد کی روایت کے مطابق جنار دھن بیکانیری بھی بڑا اچھا گویا تھا اور وہ گاہ گاہے شاہجہان کے حضور میں اپنے فن کا مظاہرہ کرتا رہتا تھا[4] ۔

تلسی رام اور دہرم داس نام کے دو گوئیے ، جن کا شمار سیف خان نے کلاونتوں کے زمرہ میں کیا ہے ، شاہجہان کے دربار میں ملازم تھے ۔ یہ دونوں

---

[1] ۔ راگ درپن ، ورق ۶۴ ب ۔

[2] ۔ ایضاً ، ورق ۵۴ الف ۔

[3] ۔ ایضاً ، ورق ۸۴ الف ۔

[4] ۔ اے شارٹ ہسٹری آف مسلم رول ان انڈیا ، مطبوعہ الہ آباد ۱۹۳۰ء ، ص ۷۶۶ ۔

دین و دھرم سے بیگانہ یا بالفاظ دگر "زندگی برائے فن" کے قائل تھے۔ اول الذکر نے شاہجہان کے عہد میں ہی انتقال کیا لیکن مؤخرالذکر راگ درپن کی تالیف کے وقت زندہ تھا۔ سیف خان لکھتا ہے کہ اب وہ ضعیف ہو چکا ہے اور اس کی آواز بھی خراب ہوگئی ہے[1]۔

ان ہندو گویوں میں راقم الحروف کا ہم وطن کب جوت پھلوری بھی بڑا نامور فن کار تھا۔ سیف خان نے بھی اُس کے کمال فن کا اعتراف کیا ہے۔ اس نے اسی اور نوے برس کے درمیان عمر پائی اور اپنے وطن مالوف میں ہی فوت ہوا[2]۔ شاہجہان کے عہد میں سندر گھن نامی ایک موسیقار کی بڑی شہرت تھی۔ شاہجہان نے اسے اپنے درباری گویوں میں شامل کر لیا تھا۔ تلسی رام اور دھرم داس کی طرح وہ بھی مذہب سے بیگانہ تھا[3]۔

سور داس پکھاوجی بھی اسی گروہ سے تعلق رکھتا تھا۔ سیف خان لکھتا ہے کہ اس نے اکبر کا عہد دیکھا ہوا تھا اور تان سین کے ساتھیوں میں سے تھا۔ جب تان سین گاتا تو یہ اس کے ساتھ پکھاوج بجایا کرتا تھا۔ آخر عمر میں وہ گانے بجانے سے معذور ہوگیا تھا۔ سیف خان نے اُسے دیکھا ہوا تھا اور بقول اُس کے اُس نے سو سال کے قریب عمر پائی[4]۔

کرپائی نامی ایک درباری گویا بھی اسی۔ از دین بیگانہ — گروہ سے تعلق رکھتا تھا اور بقول سیف خان وہ بادشاہ کا منظور نظر تھا۔ شاہجہان نے

۱۔ راگ درپن، ورق ۴۷ الف، ۴۷ ب۔

۲۔ ایضاً، ورق ۴۷ ب۔

۳۔ ایضاً، ورق ۴۸ ب۔

مجھے یوں معلوم ہوتا ہے کہ سندر گھن اس کا لقب تھا، کیونکہ گھن ایک ساز کا نام ہے وہ گھن بجانے میں ماہر تھا اس لیے اس نے سندر گھن کا لقب پایا۔ اس کا اصل نام معلوم نہیں ہو سکا۔ سیف خان نے بھی اُس کا ذکر اسی لقب کے تحت کیا ہے۔

۴۔ ایضاً، ورق ۴۹ ب۔

اس سے مردنگ سن کر اسے مردنگ رائے کے خطاب سے نوازا تھا ۔ سیف خان لکھتا ہے کہ مردنگ بجانے میں اس کا کوئی ہمسر نہ تھا[1] ۔

تارا چند کلاونت شوق طنبورہ نواز کا شاگرد تھا لیکن اس نے زیادہ عمر نہیں پائی ، اس لیے وہ زیادہ نام نہیں پا سکا ۔ سیف خان نے اس کا ذکر عہدِ شاہجہان کے گنے چنے فنکاروں میں کیا ہے[2] ۔ ہندو گویوں میں سے سالم چند ڈاگر بھی اچھا گویا تھا ۔ اس کا شمار بھی شاہجہان کے درباری گویوں میں ہوتا ہے[3] ۔

سرس بین کا شمار بھی شاہجہان کے منظورِ نظر گویوں میں ہوتا ہے ۔ اس کا باپ بھی بڑا اچھا گویا تھا اور وہ جہانگیر کی خدمت میں رہا کرتا تھا ۔ سرس بین راقم السطور کو اس کا لقب معلوم ہوتا ہے ، سیف خان نے اس کا نام نہیں لکھا حالانکہ وہ گاہ گاہے سرس بین سے راگ سنتا رہتا تھا[4] ۔

مسلمان گویوں میں بایزید بڑا اچھا فن کار تھا اور رباب بجانے میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا ۔ نوجوانی کے عالم میں اسے شراب کی لت پڑ گئی اس لیے جلد ہی مر گیا ۔ اس کا ایک ہندو شاگرد سکھر سین کلاونت بھی رباب بجانے میں ماہر تھا ۔ سیف خان نے اس کا ذکر عہد شاہجہان کے ممتاز فن کاروں میں کیا ہے[5] ۔

ایشوری پرشاد کی روایت کے مطابق شاہجہان کا درباری مؤرخ محمد صالح کنبوہ اور اس کا بھائی ہندی راگ میں کامل دسترس رکھتے تھے ۔

---

١ ۔ ایضاً ، ورق ۴۹ الف ۔

٢ ۔ ایضاً ، ورق ۴۹ ب ۔

٣ ۔ ایضاً ، ورق ۴٦ ب ۔

۴ ۔ ایضاً ، ورق ۴۸ ب ۔

٥ ۔ ایضاً ۔

مسلمان فن کاروں میں فیروز ڈاڈھی پکھاوج بجانے میں ، الہداد ڈاڈھی ساکن آڑ مڑ ٹانڈہ سارنگی بجانے میں، ابو الوفا طنبورہ بجانے میں طاہر ڈاڈھی دف بجانے میں اور صالح رباب بجانے میں اپنی نظیر نہ رکھتے تھے[1] - ان میں سے مؤخرالذکر سیف خان کی سرکار میں ملازم تھا - عہد شاہجہان میں محمد نامی ایک فنکار بین بجانے میں ملک کے طول و عرض میں مشہور تھا - بادشاہ نے از رہِ قدردانی آسے — رس بین — کا خطاب دیا تھا[2] -

غلام محی الدین نامی ایک موسیقار فوج میں ملازم تھا - آخر عمر میں اس نے فوج کی ملازمت ترک کر کے درویشی اختیار کر لی تھی - سیف خان نے اس کے مرتب کردہ راگوں کی بڑی تعریف کی ہے - راگ درپن کی تصنیف کے وقت وہ ابھی بقید حیات تھا - سیف خان کا کہنا ہے کہ وہ لوگوں کی پرواہ نہیں کرتا اس لیے لوگ بھی اس سے چنداں متعارف نہیں ہیں[3] -

شیخ سعد اللہ لاہوری بھی کسی زمانے میں بڑا اچھا گویا سمجھا جاتا تھا لیکن کثرت افیون خوری سے اس کا گلا خراب ہو گیا تھا - راگ درپن کی تصنیف کے وقت اس کی عمر ساٹھ سال سے ستجاوز تھی اس لیے بوجہ کبرسنی اس کے ذہن میں فتور پیدا ہو گیا تھا[4] - شیخ موصوف کی طرح محمد باقی مغل بھی کسی زمانے میں اچھے گویوں میں شمار ہوتا تھا لیکن شیخ کی طرح افیون کھانے سے اس کی آواز بھی خراب ہو گئی تھی - جب سیف خان راگ درپن لکھنے بیٹھا تو اس وقت اس کی عمر پچاس سال سے تجاوز کر چکی تھی[5] -

---

۱ - اے شارٹ ہسٹری آف مسلم رول ان انڈیا - مطبوعہ الہ آباد ۱۹۳۰ء ، ص ۷۶۶ -

۲ - راگ درپن ، ورق ۴۹ الف ۴۹ ب -

۳ - ایضاً ، ورق ۴۹ الف -

۴ - ایضاً -

۵ - ایضاً ، ورق ۴۶ ب -

مسلمان گویوں میں بایزید خان نو چھاروی بڑا اچھا فن کار تھا ۔ سیف خان نے اس کا ذکر کلاونتوں کے زمرہ میں کیا ہے ۔ اس نے زیادہ عمر نہیں پائی تاہم اس کا نام خدمت فن کی وجہ سے ہمیشہ زندہ رہے گا ۔ ولی ڈاڈھی بھی اپنے دور میں بڑا اچھا موسیقار مانا جاتا تھا ۔ بقول سیف خان اس نے اسی سال سے زیادہ عمر پائی اور آگرہ میں فوت ہوا[1] ۔

شاہجہان کے درباری گویوں میں رنگ خان کلاونت کا بڑا اونچا رتبہ تھا ۔ سیف خان لکھتا ہے کہ وہ اسم بامسمی اور اپنے فن میں استاد تھا اور اس نے اکبر کا عہد دیکھا ہوا تھا ۔ وہ شاہجہان کا منظور نظر تھا اس لیے شاہی تقریبات کے موقع پر بادشاہ اسے انعام و اکرام سے نوازتا رہتا تھا ۔ اورنگ زیب کی شادی کی تقریب پر اور ۱۰۴۵ھ میں نوروز کے موقع پر اس کا نام انعام یافتگان کی فہرست میں موجود ہے[2] ۔ سیف خان لکھتا ہے کہ دربار شاہی کے باہر اس کا زیادہ تر وقت اللہ والوں کے ساتھ گزرا کرتا تھا ۔ اس نے اسی اور نوے برس کے درمیان عمر پائی[3] ۔

بلاس خان کے شاگردوں میں بخت خان گجراتی نے بڑا نام پایا تھا ۔ سیف خان نے اس کا ذکر کلاونتوں کے زمرہ میں کیا ہے ۔ سیف خان لکھتا ہے کہ لوگ اس کے راگ کی بہت تعریف کرتے ہیں لیکن مجھے اس سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا البتہ میں نے اس کے ایک شاگرد بسنتی کلاونت کو سنا ہے ، وہ خوب گاتا ہے ۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ بخت خان کتنا اچھا گویا ہوگا[4] ۔

---

۱ ۔ ایضاً ، ورق ۴۶ ب ۔

۲ ۔ (i) محمد صالح کنبوہ ، شاہجہان نامہ ، جلد دوم ، مطبوعہ لاہور ۱۹۶۷ء ، ص ۱۲۳ ، ۱۸۶ ، ۳۱۸ ۔

(ii) عبدالحمید لاہوری ، بادشاہنامہ ، جلد دوم ، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۷۲ء ، ص ۱۴۲ ۔

۳ ۔ راگ درپن ، ورق ۴۶ الف ۔

۴ ۔ ایضاً ، ورق ۴۵ ب ۔

مسلمان گویوں میں نائک بھنو کا پوتا نائک افضل بھی بڑا اچھا گویا تسلیم کیا جاتا تھا ۔ شاہجہان نے اس کے کمال فن کا اعتراف کرتے ہوئے آسے گن سین کا خطاب دیا تھا ۔ نایک افضل کا انتقال کشمیر کے سفر کے دوران ہوا اور وفات کے وقت اس کی عمر پچاس سال سے متجاوز تھی[۱]۔ سیف خان نے راگ درپن میں حسین خان نوبہار کا ذکر بھی عہد شاہجہان کے ممتاز گویوں میں کیا ہے ۔ اس کی عمر بھی کوئی زیادہ نہیں ہوئی[۲] ۔

عہدِ شاہجہان میں سبحان خان کا شمار بڑے نامی گرامی گویوں میں ہوتا تھا۔ ان کی طبیعت درویشی کی طرف مائل تھی ۔ اس لیے ان کا زیادہ وقت درویشوں کے ساتھ ہی گزرتا تھا ۔ آخر عمر میں تو انھوں نے دنیا سے بالکل ہی منہ موڑ لیا تھا ۔ عنایت خان راسخ اور شاہنواز خان کی روایات کے مطابق وہ آخر عمر میں مدینہ منورہ چلے گئے تھے اور وہیں روضۂ رسولؐ پر نعتیں پڑھا کرتے تھے[۳] ۔ ان کا فرزند سید خان بھی بڑا اچھا گویا تھا ۔ راگ درپن کی تصنیف کے وقت وہ کافی ضعیف العمر ہو چکا تھا ۔ سیف خان کا کہنا ہے کہ وہ امیر خسروؒ کے علم کا ماہر تھا ۔ راگ خوب گاتا تھا تاہم دھرپد بھی برا نہیں گاتا تھا[۴] ۔

سید طیب بڈھ بھی عہد شاہجہان کے نامی گرامی گویوں میں شمار ہوتا تھا ۔ وہ آگرہ کا رہنے والا تھا اور "بات" خوب گاتا تھا ۔ اس کی عمر کچھ زیادہ نہیں ہوئی[۵] ۔ میر عماد ساداتِ ہرات سے تعلق رکھتا تھا ، اس کا شمار بھی شاہجہان کے عہد کے مشاہیر گویوں میں ہوتا ہے ۔ راگ درپن کی تصنیف

---

[۱] ۔ ایضاً ۔

[۲] ۔ ایضاً ۔

[۳] ۔ (i) رسالہ ذکر مغنیان ہندوستان ، ص ۳۶ ۔
(ii) مرأت آفتاب نما ، ورق ۳۹۶ ب ۔

[۴] ۔ راگ درپن ، ورق ۴۸ الف ۔

[۵] ۔ ایضاً ۔

کے وقت میر عماد حیات تھا ۔ سیف خان نے اس کے راگ کی بڑی تعریف کی ہے[۱] ۔ اسی طرح رحیم داد ڈاڈھی کا شمار بھی اس وقت کے اچھے گویوں میں ہوتا تھا ۔ سیف خان نے اس کے استاد کامل ہونے کا اعتراف کیا ہے[۲] ۔ ان گویوں کے علاوہ بیانہ کے ایک سورنا نواز کی بھی سیف خان نے بڑی تعریف کی ہے ۔ سیف خان راگ درپن کی تصنیف کے وقت اس کا نام بھول چکا تھا ، اس لیے اس نے اس کا ذکر — یک سورنا نواز از بیانہ — کے عنوان کے تحت کیا ہے ۔ اسی طرح ایک اور سورنا نواز جو داراشکوہ کے ساتھ رہا کرتا تھا — اپنے فن کا استاد مانا جاتا تھا ، سیف خان کے ذہن سے اس کا نام بھی محو ہو چکا تھا[۳] ۔

شاہجہان کا عہد حکومت ہر لحاظ سے مغلوں کا عہد زریں کہلانے کا مستحق ہے ۔ فن تعمیر ، موسیقی ، مصوری ، خطاطی اور دوسرے علوم و فنون کو اس عہد میں نمایاں ترقی ہوئی ۔ بعض اہل معرفت ان سب فنون کو ایک ہی چیز تسلیم کرتے ہیں ۔ ان کے خیال میں ”فن تعمیر کا حسن وہی حسن ہے جو شاعری ، موسیقی ، مصوری اور سنگ تراشی میں نظر آتا ہے[۴]“ ۔ جس طرح اقبال کو ہر چیز میں جلوۂ عشق نظر آتا ہے اور وہ بدر و حنین اور معرکۂ کربلا کو بھی عشق کا ہی نام دیتے ہیں ۔ اسی طرح ہمارے فنا فی الفن قسم کے فن کاروں کو شاہجہان کے ہر رگ و ریشے اور اس کے ہر قول و فعل سے نغمہ ہی سنائی دیتا ہے ۔ ان کے نزدیک جامع مسجد دہلی ، لال قلعہ اور تاج محل کی تعمیر کے پیچھے بھی شاہجہان کا ذوق موسیقی ہی کارگر نظر آتا ہے ۔ پروفیسر محمد مجیب تاج محل کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں ۔

---

۱ - ایضاً ۔

۲ - ایضاً ، ورق ۴۷ ب ۔

۳ - ایضاً ، ورق ۹۴ ب ۔

۴ - پروفیسر محمد مجیب ، مضمون ”قطب صاحب کی عمارتیں“ ۔ مشمولہ ”نذر عرشی“ مطبوعہ دہلی ۱۹۶۵ء ، ص ۱۰۵ ۔

تاج محل میں معمار کا تصور ان بلندیوں تک پہنچ گیا ہے جہاں عمارت، شعر اور نغمہ مل کر وجد کی کیفیت بن جاتے ہیں[1] ۔

* * *

آیا کہاں سے نالۂ نے میں سرور مے
اصل اس کی نے نواز کا دل ہے کہ چوبِ نے

(اقبال)

---

[1] ۔ پروفیسر محمد مجیب، مضمون ”فن تعمیر“ مشمولہ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی کارنامے، مطبوعہ اعظم گڑھ ۱۹۶۳ء، ص ۳۴ ۔

عہدِ اورنگ زیب میں موسیقی اور موسیقار

اطالوی سیاح اور "ستوریا دوموگر" کے مصنف منوچی کی یہ روایت زباں زد خلائق ہے کہ جب اورنگ زیب عالمگیر نے اپنے دربار میں موسیقی کے مظاہروں پر پابندی عاید کر دی اور گویوں کو چلتا کیا تو ایک روز گویے ایک جھوٹ موٹ کا جنازہ لے کر روتے پیٹتے شاہی محل کے قریب سے گذرے۔ اورنگ زیب ان کی آہ و بکا سے بہت متاثر ہوا اور اس نے اپنے ایک مصاحب سے دریافت کیا کہ یہ کس کا جنازہ جا رہا ہے؟ اس نے دست بستہ عرض کیا، "موسیقی کا"۔ اس جواب پر اورنگ زیب ہنس دیا اور اس نے گویوں کو پیغام بھیجا کہ اس مردود مردے کو گہری قبر میں دفن کر دیں کہ کبھی پھر باہر نہ نکل آئے۔ منوچی کی اس روایت سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اورنگ زیب کے عہد حکومت میں موسیقی کا جنازہ نکل گیا تھا لیکن حقائق اس نظریے کی تائید نہیں کرتے۔

اورنگ زیب کی تخت نشینی کے بعد گیارہ سال تک موسیقار شاہی دربار میں موسیقی کے مظاہرے کرتے رہے۔ جب اسلامی اصلاحات کے تحت دربار میں موسیقی کے مظاہرے بند ہوئے تو اس کے بعد بھی موسیقار دربار میں باریاب ہوتے رہے اور اورنگ زیب ان کی مالی امداد کرتا رہا۔

شاہجہان نے اپنے چاروں بیٹوں کی شادی خوب دھوم دھام کے ساتھ کی تھی۔ ان موقعوں پر "مطربان ہفت کشور" کئی کئی روز تک اپنے فن کا مظاہرہ کرتے رہے۔ ۱۶۳۶ء میں اورنگ زیب کی دلرس بانو کے ساتھ شادی کے موقع پر موسیقی کی خصوصی محافل منعقد ہوئیں[1]۔ عبدالحمید لاہوری رقمطراز

---

[1] محمد صالح کنبوہ : عمل صالح (لاہور ۱۹۶۷ء) ج ۲ : ص ۱۸۶ -

ہے کہ ان دنوں موسیقی کا اتنا زبردست مظاہرہ ہوا کہ کئی روز تک زمین سے آسمان پر گانے بجانے کے سوا اور کوئی آواز نہیں پہنچی[1]۔ شہزادگی کے عالم میں دکن میں قیام کے دوران اورنگ زیب ایک مغنیہ ہیرا بائی زین آبادی پر فریفتہ ہوگیا تھا ۔ ہیرا بائی کا شمار شاہجہانی عہد کے معروف موسیقاروں میں ہوتا ہے۔ بدقسمتی سے اس کا انتقال عین عالمِ شباب میں ہوگیا اور اورنگ زیب کو اس کی موت کا صدمہ برداشت کرنا پڑا[2] ۔

اورنگ زیب نے اپنی تخت نشینی کے موقع پر ایک عظیم الشان جشن منایا ۔ اس کا ہمعصر مؤرخ محمد ساقی مستعد خان لکھتا ہے کہ اس موقع پر بہت سے علماء فضلاء شعراء اور موسیقار دربار میں باریاب ہوئے اور انعام کے مستحق ٹھہرے[3] ۔ مختلف جشنوں کے موقعوں پر گویے دربار میں بار پاتے اور اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ۔ محمد ساقی رقمطراز ہے کہ بادشاہ نے موسیقی کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور اس فن لطیف کی باریکیوں پر اس کی گہری نظر تھی[4] ۔

تخت نشینی کے بعد داراشکوہ اور شجاع کے خلاف جنگوں کی وجہ سے وہ دو اڑھائی سال تک بڑا مصروف رہا ۔ اس لیے وہ اس عرصے میں موسیقی کی طرف توجہ نہ دے سکا ۔ ان مخمصوں سے فارغ ہوکر اورنگ زیب نے اپنی تخت نشینی کی تیسری سالگرہ بڑے تزک و احتشام کے ساتھ منائی ۔ اس تقریب میں نامی گرامی گویوں نے حصہ لیا۔ درباری مؤرخ محمد کاظم نے عالمگیر نامہ میں اس تقریب کی ”ہنگامہ آرائی و طرب سازی برامشگری و نغمہ پردازی“ کا

---

۱ ۔ عبدالحمید لاہوری ، بادشاہ نامہ ، (کلکتہ ۱۸۷۲ء) ج ۲ : ص ۲۶۸ ۔
”از نغمہ و ساز مطربان سحر پرداز عیش و طرب را روز بازاری و سرور و انبساط را سروکاری دیگر شد ۔ بگوش آسمانیان جز صدای کامرانی نمی رسید“ ۔

۲ ۔ مولانا ابو الکلام آزاد ، غبار خاطر (انارکلی کتاب گھر لاہور) ، ص ۲۸۷ ۔

۳ ۔ محمد ساقی مستعد خان : مآثر عالمگیری ، (کلکتہ ۱۸۶۱ء) ، ص ۲۳ ۔

۴ ۔ ایضاً ، ص ۵۲۷ ۔ و بغایت دقیقہ سنج این فن بودند ، ص ۴۰۲ ۔

ذکر کیا ہے[1]۔ اس موقع پر اورنگ زیب، بلاس خان کے نواسے اور گن سمندر لعل خان کلاونت کے بیٹے خوشحال خان کے فن سے بڑا متاثر ہوا اور اسے روپوں کے برابر تولنے کا حکم دیا۔ چنانچہ اسے اپنے وزن کے برابر سات ہزار روپے عطا ہوئے[2]۔

اورنگ زیب نے شجاع کی شکست کے بعد ایک خصوصی جشن منعقد کیا۔ اس موقع پر درباری گویوں نے اپنے فن کا عظیم الشان مظاہرہ کیا۔ بادشاہ نے از راہِ قدر دانی خوشحال خان کو ایک سو طلائی مہریں عنایت کیں[3]۔

اورنگ زیب نے اپنے فرزند محمد معظم کی شادی راجہ روپ سنگھ راٹھور کی بیٹی کے ساتھ روایتی انداز سے کی۔ درباری مؤرخ محمد کاظم لکھتا ہے کہ جب بارات روانہ ہوئی تو "طائفہ مطربان و اہل عشرت و سرور از اناث و ذکور با دف و ساز بہ نغمہ شادی و آہنگ مبارکباد گلبانگ نشاط بر کشیدہ ترانہ سرایان و سرود گویان پیش می آمدند و آواز نقارہ و کرنا و صفیر و سرنا از بالائی سفائن چراغاں کہ بر روی دریا جلوہ گر بود و آوازۂ شکوہ و جلالت بگوش گردون می رسانید[4]"۔ بادشاہ اس وقت "غسلخانہ" میں تھا۔ اس نے وہاں ایک خصوصی محفل منعقد کی جس میں شعلہ نوا موسیقاروں نے حصہ لیا۔ اس موقع پر موسیقاروں نے اپنے فن کا ایسا عمدہ مظاہرہ کیا کہ فلک پر ناہید بھی رقص کرنے لگی[5]۔ اورنگ زیب نے ان "نغمہ سرایان خوش آواز و ترانہ گویان طرب ساز" کو دل کھول کر انعام و اکرام سے نوازا۔ خوشحال خان کلاونت اور اس کے بھائی بسرام خان کو تین ہزار روپے نقد اور چار ہزار روپے کی مالیت کے ریشمی جوڑے اور کشیدہ کار چغے عطا کیے۔ ان کے علاوہ جوہر خان

---

۱ - محمد کاظم : عالمگیر نامہ (کلکتہ ۱۸۶۸ء) ، ص ۳۸۲ -

۲ - ایضاً ، ص ۳۸۸ -

۳ - ایضاً ، ص ۲۹۳ -

۴ - ایضاً ، ص ۶۳۲ -

۵ - ایضاً ، ص ۶۳۹ -

کلاونت کو بھی دو ہزار روپے عنایت کیے[1]۔ شادی کے بعد دولھا نے اپنی قیام گاہ پر ایک ضیافت کا انتظام کیا۔ اس تقریب میں موسیقاروں اور سازندوں نے بھی حصہ لیا اور انھوں نے دف، چنگ، بربط اور عود بجا کر حاضرین کو محظوظ کیا[2]۔

اورنگ زیب نے اپنی بیالیسویں قمری سالگرہ روایتی انداز سے منائی۔ اس روز بادشاہ نے پانچ ہزار روپے درباری گویوں میں تقسیم کیے[3]۔ اپنی تخت نشینی کی ساتویں سالگرہ پر اورنگ زیب نے خوشحال خان کلاونت کو ایک گھوڑا عطا کیا[4]۔ تینتالیسویں سالگرہ داراشکوہ اور شجاع کے خلاف جنگوں میں مصروفیت کی وجہ سے سادگی کے ساتھ منائی گئی۔ اورنگ زیب نے اپنی چوالیسویں قمری سالگرہ کے دن پانچ ہزار روپے کی مالیت کے کشیدہ کار جوڑے ”اہل ساز و نوا“ کو عطا کیے[5]۔ اسی طرح اس نے اپنی چوالیسویں شمسی سالگرہ کے موقع پر دربار لگایا اور اس روز گویوں اور سازندوں کو سات ہزار روپے عنایت کیے[6]۔ اسی طرح بادشاہ نے اپنی پینتالیسویں قمری سالگرہ کے موقع پر تین ہزار روپے موسیقاروں میں بانٹے[7]۔ جب اورنگ زیب نے شمسی حساب سے اپنی پینتالیسویں سالگرہ منائی تو اس تقریب سعید کے موقع پر چار ہزار روپے گویوں کو عطا کیے[8]۔

اورنگ زیب کے چھیالیسویں جنم دن کے موقع پر دربار سجایا گیا۔ اس روز گن سمندر لعل خان کلاونت کے بیٹے بسرام خان نے بادشاہ کے حضور میں اپنے

---

[1] ۔ ایضاً، ص ۶۴۴ ۔

[2] ۔ ایضاً، ص ۶۴۱ ۔

[3] ۔ ایضاً، ص ۴۲۸ ۔

[4] ۔ ایضاً، ص ۸۵۷ ۔

[5] ۔ ایضاً، ص ۵۶۷ ۔

[6] ۔ ایضاً، ص ۶۳۲ ۔

[7] ۔ ایضاً، ص ۶۲۶ ۔

[8] ۔ ایضاً، ص ۷۶۳ ۔

فن کا مظاہرہ کیا ۔ "شاہ سخاوت شعار" نے خوش ہوکر اسے ایک ہزار روپے عنایت کیے ۔ اس کے علاوہ جو گویے بادشاہ کو جنم دن کی مبارکباد دینے آئے انھیں آٹھ ہزار روپے ملے[1] ۔

اورنگ زیب نے اپنی سینتالیسویں قمری سالگرہ روایتی انداز سے منائی ۔ اس تقریب سعید کے موقع پر کشمیری گویوں کو شرف باریابی ملا ۔ بادشاہ نے ان کے فن کا مظاہرہ دیکھ کر انھیں تین ہزار روپے عطا کیے ۔ ان کے علاوہ درباری گویوں کو بھی اتنی رقم ملی[2] ۔ بادشاہ نے اپنی سینتالیسویں شمسی سالگرہ کے موقع پر دو ہزار روپے درباری گویوں میں تقسیم کیے[3] ۔

محمد کاظم لکھتا ہے کہ تخت نشینی کی آٹھویں سالگرہ کے موقع پر بادشاہ نے پانچ ہزار روپے کی خطیر رقم موسیقاروں کو بطور انعام دی[4] ۔ جب ۱۶۶۵ء میں اورنگ زیب نے اپنی شمسی سالگرہ منائی تو پانچ ہزار روپے "اہل غنا" میں بانٹے گئے ۔ اسی طرح ایک بار عید کے روز جشن مسرت منایا گیا، تو بادشاہ نے پانچ ہزار روپے نغمہ پردازوں کو عنایت کیے[5] ۔ چند ماہ بعد جب اس نے قمری حساب سے اپنی سالگرہ منائی تو مزید پانچ ہزار روپے "نغمہ سرایان خوش آواز" کے حصے میں آئے ۔ ۱۶۶۶ء میں جب اورنگ زیب نے شمسی حساب سے اپنی سالگرہ منائی تو اس روز مطربوں کو چار ہزار روپے عنایت کیے[6] اسی طرح تخت نشینی کی نویں سالگرہ کے موقع پر ایک تقریب منعقد ہوئی، جس میں موسیقاروں کو پانچ ہزار روپے عطا کیے گئے ۔

---

[1] ایضاً، ص ۷۵۶ ۔

[2] ایضاً، ص ۸۳۲ ۔

[3] ایضاً، ص ۸۷۲ ۔

[4] ایضاً، ص ۸۸۲ ۔

[5] ایضاً، ص ۶۲۰ ۔

[6] ایضاً، ص ۹۸۲ ۔

عالمگیری عہد کے موسیقار

شیخ محمد اکبر آبادی شاہجہان کا درباری گویا تھا ۔ اس کے پوتے معین الدین کو فن موسیقی پر کامل عبور تھا ۔ شاہنواز خان اس کے بارے میں لکھتا ہے کہ خیال گانے میں وہ اپنے ہمعصروں سے گوئے سبقت لے گیا تھا[1] ۔

"رسالہ ذکر مغنیان ہند" کا مصنف راسخ خان رقمطراز ہے کہ اُس نے احمد شاہ (۱۷۵۴ - ۱۷۴۸ء) کے عہد میں معین الدین کو دیکھا تھا ۔ اس وقت اگرچہ وہ بہت بوڑھا ہو چکا تھا لیکن پھر بھی قوالی اور ترانہ پیش کرنے میں اس کا کوئی ہمسر نہ تھا[2] ۔ یہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ معین الدین کی تربیت عالمگیری عہد میں ہوئی تھی ۔ اورنگ زیب کے ابتدائی عہد حکومت میں سرس بائی نامی ایک مغنیہ نے اقلیم موسیقی میں بڑا نام پیدا کیا ۔ اورنگ زیب کا بھائی مراد اس پر فریفتہ ہوگیا تھا اور اس کے بغیر اس کو ایک لمحہ گزارنا دشوار تھا ۔ جب اورنگ زیب نے مراد کو قلعہ گوالیار میں نظر بند کیا تو سرس بائی نے اس مشکل میں مراد کا ساتھ دیا ۔ ایک شب مراد نے قید سے فرار ہونے کا انتظام کر لیا تو سرس بائی جدائی کے تصور سے رونے لگی اور اس کا گریہ و بکا سن کر پہریدار چوکنا ہوگئے اور انھوں نے مراد کے فرار کی کوشش ناکام بنا دی[3] ۔

شیخ کمال کو شاہجہان کے درباری گویے میاں ڈالو ڈھاڈی سے تلمذ تھا ۔ اس کے سیف خان صاحب راگ درپن کے ساتھ بڑے اچھے مراسم تھے ۔ وہ عالمگیری عہد کا ممتاز گویا تھا ۔ جب اورنگ زیب نے شاہی دربار سے موسیقی

---

[1] شاہنواز خان : مرآۃ آفتاب نما مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری نمبر فارسی ۲۴ ورق ۲۹۷ الف ۔

[2] راسخ خان : رسالہ مغنیان ہند (پٹنہ ۱۹۶۱ء) ، ص ۳۶ ۔

[3] ابوالکلام آزاد : غبار خاطر (انارکلی کتاب گھر لاہور)، ص ۸۵ ۔

اور موسیقاروں کو چلتا کیا تو شیخ کمال اپنا پیشہ ترک کر کے فوج میں بھرتی ہو گیا[1]۔

مصری خان ڈھاڈی، میاں تان سین کے فرزند بلاس خان کا شاگرد تھا۔ اس کا شمار عالمگیری عہد کے نامور موسیقاروں میں ہوتا ہے۔ وہ شہزادہ شجاع کے دربار سے منسلک رہ چکا تھا۔ مصری خان نے بہت سی راگنیاں تیار کی تھیں[2]۔

سکھ سین کلاونت، بایزید کا شاگردِ رشید تھا اور رباب بجانے میں اپنی نظیر آپ تھا۔ راگ درپن کی تصنیف کے وقت وہ بقید حیات تھا۔ سیف خان لکھتا ہے کہ بادشاہ اس کے حال پر مہربان تھا[3]۔

غلام محی الدین کا شاہجہانی اور عالمگیری دور کے ممتاز گویوں میں شمار ہوتا تھا۔ وہ فوج میں بھرتی ہو گیا تھا اور ریٹائرمنٹ کے بعد اس نے درویشی اختیار کر لی تھی۔ راگ درپن کی تصنیف کے وقت وہ ہنوز زندہ تھا۔ سیف خان نے اس کے فن کی بڑی تعریف کی ہے۔ وہ صاحبِ تصانیف تھا[4]۔

شیخ سعد اللہ لاہوری کا شمار بھی عالمگیری عہد کے مشہور گویوں میں ہوتا تھا، سیف خان لکھتا ہے کہ اس نے افیون کھانا شروع کر دی تھی جس کی وجہ سے اس کا گلا بیٹھ گیا تھا۔ راگ درپن کی تصنیف کے وقت وہ فقر و تجرد کی زندگی گذار رہا تھا۔ اس وقت اس کی عمر ساٹھ سال سے متجاوز تھی[5]۔

---

[1] سیف خان: راگ درپن (دہلی ۱۹۸۱ء)، ص ۷۲۔

[2] ایضاً، ص ۷۲ - ۷۱۔

[3] ایضاً، ص ۷۶۔

[4] ایضاً، ص ۷۳۔

[5] ایضاً، س ۷۴۔

محمد باقی مغل نے عالمگیری عہد میں فن موسیقی میں بڑا نام پیدا کیا اور اس نے کئی راگنیاں تیار کیں - بد قسمتی سے وہ افیون کھانے لگا ، جس کا اثر اس کے گلے پر ہوا - راگ درپن کی تصنیف کے وقت اس کی عمر پچاس کے لگ بھگ تھی[1] -

بسنتی کلاونت عالمگیری عہد کا ایک نامور گویا تھا - اسے بلاس خان کے ایک شاگرد بخت خان گجراتی سے تلمذ تھا - سیف خان نے اس کا گانا سنا تھا - وہ اس کے فن کا بڑا مداح نظر آتا ہے[2] -

نعمت خان کو محمد شاہ (۱۷۴۸ - ۱۷۱۹ء) نے سدا رنگ کا خطاب دیا تھا ، وہ عالمگیری دور کا ایک مشہور و معروف گویا تھا اور اسے دھرپد ، خیال اور ترانے پر کامل دسترس تھی - اس نے نیازی قوال اور لالہ بنگالی کے ساتھ مل کر کئی دھنیں تیار کی تھیں - اورنگ زیب کی وفات کے بعد اس کے جانشین بہادر شاہ اول نے اسے درباری گویوں میں شامل کر لیا تھا - وہ محمد شاہ کے عہد تک دربار سے وابستہ رہا[3] -

سید خان، شاہجہان کے درباری گویے سبحان خان کا پوتا تھا - اورنگ زیب کے عہد میں اس کا شمار نامور گویوں میں ہوتا تھا - وہ دھرپد گانے میں اپنی نظیر آپ تھا - سیف خان لکھتا ہے کہ اُسے امیر خسرو کے فن پر کامل دسترس تھی[4] -

میر عماد کا تعلق سادات ہرات سے تھا - وہ شاہجہان کے عہد میں ہندوستان آیا - بادشاہ نے از رہ قدر دانی اسے اپنے دربار میں جگہ دی - اس

---

[1] ایضاً -

[2] ایضاً ، ص ۷۲ -

3. Dr. Abdul Halim: Essays On History of Indo-Pak Music : Dacca, 1962. p. 91.

[4] سیف خان : راگ درپن ، ص ۷۶ -

کا شمار عالمگیری عہد کے عظیم فنکاروں میں ہوتا ہے ۔ راگ درپن کی تصنیف کے وقت وہ ہنوز بقید حیات تھا ۔ سیف خان لکھتا ہے کہ اسے فن موسیقی پر عبور کامل تھا اور اس نے چند تصانیف اپنی یادگار چھوڑی ہیں[1] ۔

سوبھل سین نبیرہ٭ میاں تان سین شاہجہانی عہد کا ایک ممتازگویا تھا ۔ وہ شہزادہ شجاع کے دربار سے منسلک ہوگیا تھا ۔ عالمگیری عہد میں اس کے فرزند سودھن سین نے اپنے والد کی روایت کو قائم رکھا ۔ وہ سیف خان کی سرکار سے وابستہ ہوگیا تھا ۔ راگ درپن کی تصنیف کے وقت وہ ابھی زندہ تھا ۔ سیف خان نے اس کی تصانیف کا بھی ذکر کیا ہے[2] ۔

عیدی سنگھ ، راجہ روز افزوں کا فرزند اور کھڑک پور کے فرمانروا راجہ رام شاہ کا پوتا تھا ۔ آسے امیر خسرو٭ اور سلطان حسین شرقی کے فن پر عبور کامل تھا ۔ سیف خان رقمطراز ہے کہ وہ گاہے ماہے اُسے اپنے فن سے محظوظ کرتا رہتا ہے ۔ اس نے کئی راگنیاں تیار کی تھیں ۔ وہ خیال اور ترانہ خوب گاتا تھا[3] ۔

سرس بین عالمگیری عہد کا ایک ممتاز سازندہ تھا ۔ اس کا دادا اکبر کے دربار سے منسلک رہا تھا اور والد جہانگیر کی سرکار میں ملازم تھا ۔ سرس بین نے شاہجہان کا زمانہ دیکھا تھا اور اس کے دربار میں اپنے فن کا مظاہرہ کر چکا تھا ۔ عالمگیری عہد میں سیف خان اس کی سرپرستی کرتا تھا اور وہ گاہے ماہے آسے فن سے محظوظ کرتا رہتا تھا ۔ ۱،۶۶۶ء - ۵،۰ ـ ۶ میں وہ بقید حیات تھا ۔ سیف خان کے علاوہ اورنگ زیب بھی اس کے حال پر توجہ کرتا رہتا تھا[4] ۔

---

[1] - ایضاً ، ص ۷۵ -

[2] - ایضاً ، ص ۷۱ -

[3] - ایضاً ، ص ۷۵ -

راگ درپن کے بعض قلمی نسخوں میں عیدی سنگھ کو عدیل سنگھ بھی لکھا گیا ہے جو اقرب الی الصحت معلوم ہوتا ہے ۔

[4] - ایضاً ، ص ۷۶ -

رحیم داد ڈھاڈی عالمگیری عہد کا ممتاز گویا تھا۔ اس نے کئی راگنیاں تیار کی تھیں۔ راگ درپن کی تصنیف کے وقت وہ بقید حیات تھا[1]۔ ایک روایت کے مطابق اس نے شاہجہان کے بیٹوں کو موسیقی کی تعلیم دی تھی[2]۔

مردنگ رائے جس کا اصل نام کرپا رام تھا، عالمگیری عہد کا ایک نامور سازندہ تھا۔ سیف خان کی روایت کے مطابق ساز بجانے میں اس کا کوئی ثانی نہ تھا۔ اُسے علم مارگ پر دسترس تھی اور بادشاہ بھی اس کے حال پر متوجہ تھا۔ راگ درپن کی تصنیف کے وقت وہ زندہ تھا[3]۔

حیاتی، عالمگیری عہد کا ایک ممتاز ربابی تھا۔ اس نے سیف خان کی ملازمت اختیار کر لی تھی۔ سیف خان اس کے فن کی تعریف کرتے ہوئے اس کی درازی عمر کے لیے بارگاہِ رب العزت میں دعا گو تھا[4]۔

امان اللہ عالمگیری عہد کا مشہور پکھاوجی تھا اور اس فن میں وہ اپنے ہمعصروں سے بہت آگے نکل گیا تھا۔ اس نے بھی سیف خان کی ملازمت اختیار کر لی تھی اور راگ درپن کی تصنیف کے وقت وہ بقید حیات تھا[5]۔

رس بین، جس کا اصل نام محمد تھا، عالمگیری عہد کا ایک نامور سازندہ تھا۔ راگ درپن کی تصنیف کے وقت وہ زندہ تھا[6]۔

---

[1] ۔ ایضاً، ص ۷۵ ۔

[2] ۔ آغا صادق، ماہنامہ قند، مردان، موسیقی نمبر (مئی، جون ۱۹۶۰ء)، ص ۶۱ ۔

[3] ۔ سیف خان: راگ درپن، ص ۷۷ ۔

[4] ۔ ایضاً ۔

[5] ۔ ایضاً ۔

[6] ۔ ایضاً ۔

سید نظام الدین مدھ نائک ، بلگرام کے رہنے والے تھے - مسلمان اساتذہ سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ بنارس گئے اور وہاں سنسکرت زبان سیکھی اور موسیقی کا مطالعہ کرتے رہے - ان کے ہمعصر انھیں ہندوستانی موسیقی پر سند سمجھتے تھے - وہ قریب قریب تمام ساز بجا لیتے تھے - موسیقی کی قلمرو میں انھیں نائک کا مقام حاصل تھا - انھوں نے "ناد چندرکا" اور "مدھ نائک سنگار" کے عنوانات سے ہندوستانی موسیقی پر دو کتابیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں - وہ نئی دھنیں بھی تیار کر لیتے تھے - میر غلام علی آزاد بلگرامی لکھتے ہیں کہ جب موسیقار ان کی مرتب کردہ دھنیں گاتے ہیں تو پہلے اپنے کان پکڑتے ہیں، جو ان کے ہاں کسی کی تعظیم کی انتہائی صورت ہے - سید نظام الدین ۱۶۸۸ء میں فوت ہوئے -

عوض محمد کامل خانی عالمگیری عہد کا ایک پڑھا لکھا گویا تھا - اس نے فن موسیقی پر "رسالہ عمل بین و ٹھاٹھ راگہای ہندی" اور "رسالۂ کامل خان" کے عنوان سے دو تصانیف اپنی یادگار چھوڑی ہیں[۲] - یہ بڑی حیرانی کی بات ہے کہ سیف خان نے راگ درپن میں اس فاضل موسیقار کا ذکر نہیں کیا -

مرزا ابو الخیر ، عوض محمد کامل خانی کا ہونہار فرزند تھا - اس نے موسیقی کا فن اپنے والد سے ورثہ میں پایا تھا[۴] - "رسالۂ کامل خان" کی ایک تحریر سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ اس نے فن موسیقی پر ایک کتاب لکھی تھی جس میں "تعین مخارج نغمات" کے عنوان سے چند جدولیں بھی موجود تھیں[۳] -

---

۱ - آزاد بلگرامی : مآثر الکرام (لاہور ، ۱۹۱۳ء) ، ص ۳۵۶ - ۳۵۷ -

۲ - زخاؤ : فہرست مخطوطات فارسیہ ، بوڈلین لائبریری آکسفورڈ - مخطوطات نمبر ۹ ۰ ۱۸۴۸ -

۳ - ایضاً ، ص ۱۰۶۷ -

۴ - ایتھے، فہرست مخطوطات فارسیہ ، انڈیا آفس لائبریری ، لندن (آکسفورڈ ۱۹۳۷ء) ، جلد ۲ ، مخطوطہ نمبر ۱۶۰۲ -

ابو الحسن قیصر ، عالمگیری عہد کا ایک ممتاز شاعر اور موسیقار تھا - اس کا فارسی دیوان انڈیا آفس لائبریری لندن میں محفوظ ہے - ابو الحسن نے "معرفۃ النغم" کے عنوان سے فنِ موسیقی پر ایک بلند پایہ تصنیف بھی اپنی یادگار چھوڑی ہے - اس نادر تصنیف کا ایک مخطوطہ بوڈلین لائبریری آکسفورڈ میں موجود ہے[1] -

میاں تان سین کے فرزند بلاس خان کا نواسہ اور دربار شاہجہان کے نامور موسیقار گن سمندر کا بیٹا خوشحال خان عالمگیری عہد کا سب سے ممتاز گویا تھا - شاہجہان نے اسے اپنے دربار میں میاں تان سین کی جگہ پر کھڑے ہو کر راگ پیش کرنے کی خصوصی اجازت مرحمت کی تھی[2] - عالمگیری عہد میں دربار میں منعقد ہونے والی تقریبات میں خوشحال خان پیش پیش رہتا تھا اور بادشاہ بھی اسے انعام و اکرام سے نوازتا رہتا تھا -

بسرام خان ، گن سمندر لعل خان کلاونت کا نورِ نظر اور عالمگیری عہد کا نامور موسیقار تھا - وہ شاہجہان اور عالمگیر کا درباری گویا تھا - تخت نشینی کی سالگرہ اور جنم دن کی تقریبات میں وہ اپنے بھائی خوشحال خان کے ساتھ حصہ لیا کرتا تھا - بسرام خان ۱۶۷۲ء میں فوت ہوا - اس کی وفات کے بعد اورنگ زیب نے اس کے بھائی خوشحال خان اور فرزند بھوپت کو شرف باریابی بخشا اور انہیں خلعت عطا کیے[3] -

عالمگیری عہد کے امراء

آصف الدولہ جملۃ الملک اسد خان کا شمار اورنگ زیب کے ممتاز درباری امراء میں ہوتا تھا - وہ ۱۶۷۶ء میں وزیر مقرر ہوا - شاہنواز خان رقمطراز ہے کہ وہ علماء و فضلاء کی سرپرستی میں اپنے ہمعصروں سے گوے سبقت لے

---

[1] ۱ - زخاؤ - کتاب مذکورہ بالا ، مخطوطہ نمبر ۱۸۵۰ -

[2] ۲ - عنایت خان راسخ ، رسالہ ذکر مغنیان ہند (پٹنہ ۱۹۶۱ء) ، ص ۳۵ -

[3] ۳ - محمد ساقی مستعد خان : مآثر عالمگیری ، ص ۱۰۹ -

گیا تھا ۔ اس کے بارے میں یہ کہا جاتا تھا کہ وہ تنخواہ سے کہیں زیادہ رقم موسیقاروں پر خرچ کرتا تھا[1] ۔

اورنگ زیب کے ایک درباری امیر مرزا مکرم خان صفوی کو فن موسیقی پر کامل دسترس تھی اور اُسے اس فن لطیف پر سند مانا جاتا تھا ۔ محمد ساقی مستعد خان نے موسیقی کے موضوع پر مکرم خان اور اورنگ زیب کی ایک گفتگو بھی ریکارڈ کی ہے[2] ۔

فقیر اللہ سیف خان ، جو عالمگیری عہد میں بہار ، الہ آباد اور کشمیر کا گورنر رہ چکا تھا ، موسیقی اور موسیقاروں کا بہت بڑا سرپرست تھا ۔ وہ خود بھی کئی راگ اور راگنیاں گا لیتا تھا ۔ اس کے بارے میں ناصر علی سرہندی کا یہ شعر زبان زدِ خلائق ہے[3] :

گفتگوئے طوطی از آئینہ می خیزد علی
گر نباشد سیف خان ما را نفس درکار نیست

سیف خان کے بارے میں شاہنواز خان لکھتا ہے :

ہموارہ در حضور پادشاہی دولت بار می افروخت و بدوام روشناسی خود را در نوازش می ساخت[4] ۔

---

۱ ۔ شاہنواز خان : مآثرالامرأ ، (کلکتہ ۱۸۸۱ء) ج ۱ ، ص ۳۲۰ ۔
"گویند اخراجات محل و اہل نغمہ و نشاط آنقدر داشت کہ مداخل بدان وفا نمی کرد" ۔

۲ ۔ محمد ساقی مستعد خان : مآثر عالمگیری ، ص ۵۲۷ ۔

۳ ۔ ناصر علی سرہندی ، دیوان ناصر علی (نظامی پریس دہلی ۱۲۹۲ھ) ، ص ۲۲ ۔

۴ ۔ شاہنواز خان ، مآثر الامراء : ج ۲ ، ص ۲۸۰ ۔

ترجمہ : وہ ہر وقت بادشاہ کے حضور میں رہتا تھا اور اسی حضورِ دوام کی وجہ سے انعام و اکرام سے سرفراز ہوتا رہتا تھا ۔

ایک دوسرے موقع پر شاہنواز خان نے اس کے کمال فن کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے :

در راگ و نغمہ بسیار ماہر بود[1] ۔

ترجمہ : وہ راگ و نغمہ کے فن میں بڑی مہارت رکھتا تھا ۔

سیف خان نے موسیقی کی مشہور کتاب “مانکتوہل” کا ، جو گوالیار کے حاکم راجہ مان سنگھ کے عہد کی تصنیف تھی ، فارسی میں ترجمہ کیا تھا ۔ اس نے اس کتاب میں ایک باب کا اضافہ کیا جس میں شاہجہان کے درباری گویوں کے بارے میں ایسی اہم معلومات بہم پہنچائی ہیں ، جو کہیں اور نہیں ملتیں ۔ سیف خان کے ان فنکاروں کے ساتھ ذاتی مراسم تھے اور اس نے ان میں سے اکثر کے فن کا مظاہرہ بھی دیکھا تھا ۔ جب اورنگ زیب نے اپنی مملکت میں اسلامی اصلاحات نافذ کیں تو دربار سے گویوں کو بھی چلتا کیا ۔ اس مشکل میں سیف خان نے کئی درباری گویوں کو اپنی ملازمت میں لے لیا ۔

سرکاری ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد اس نے پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ کے بالمقابل قلعہ بہادر گڑھ کی جگہ پر سیف آباد کے نام سے ایک گاؤں آباد کیا ۔ پروفیسر فوجا سنگھ باجوا نے پٹیالہ کے بارے میں اپنی ایک تصنیف میں اس کے مقبرے اور ملحقہ مسجد کی تصویریں شائع کرکے اہل علم پر بڑا احسان کیا ہے[2] ۔ اسی طرح پروفیسر نورالحسن انصاری اور ڈاکٹر شتروگھن شکلا بھی ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں ، انھوں نے راگ درپن کو بڑی محنت کے ساتھ مرتب کرکے شعبۂ فارسی دہلی یونیورسٹی کی طرف سے ۱۹۸۱ء میں شائع کر دیا ہے ۔

---

[1] ایضاً ، ص ۳۸۲ ۔

[2] Bajwa, F.S. Patiala and its Historical Surroundings, Patiala : 1967, pp. 67-68.

عطاء الملک ، جو فاضل خان کے لقب سے مشہور ہے ، شاہجہان کے ساتویں سال جلوس میں ہندوستان آیا ۔ اورنگ زیب نے اسے قلمدانِ وزارت عطا کیا ۔ اس کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ اس کے ہمعصروں میں اس سے زیادہ کوئی شخص موسیقی اور ہندوستانی راگوں سے واقف نہیں تھا[1] ۔

عالمگیری عہد کے مشائخ کرام

شیخ داؤد گنگوہیؒ ، جو حضرت عبدالقدوس گنگوہی کے احفاد میں سے تھے ، اپنے زمانے کے نامور صوفی تھے ۔ ان کا مزار گنگوہ شریف میں مرجع خلایق ہے ۔ ان کے مریدوں میں سے شاہ ابو المعالی انبیٹھویؒ نے دنیائے تصوف میں بڑا نام پایا ۔ مؤخرالذکر بزرگ حضرت میران بھیکؒ عرف شیخ بھیکا کے مرشد تھے ۔ ان کا انتقال اورنگ زیب کے پانچویں سال جلوس میں ہوا ۔ بختاور خان لکھتا ہے کہ انھیں سماع کے ساتھ بڑی رغبت تھی[2] ۔

حضرت میران بھیکؒ نے اورنگ زیب کا آخری زمانہ دیکھا تھا ۔ موصوف چشتیہ صابریہ سلسلے کے نامور پیرِ طریقت گزرے ہیں ۔ حضرت میران بھیک ، بھاشا زبان کے شاعر تھے اور بھیکا تخلص کرتے تھے ۔ موصوف باقاعدہ سماع سنا کرتے تھے ۔ خواجہ الطاف حسین حالی لکھتے ہیں کہ ایک بار نواب روشن الدولہ کے ہاں ایک مغنیہ نوربائی نے ان کی موجودگی میں عمر خیام کی یہ رباعی پڑھی :

شیخ بہ زنِ فاحشہ گفتا مستی
کز خیر گسستی و بہ شر پیوستی

زن گفت چنانکہ مینمایم ہستم
تو نیز چنانکہ مینمائی ہستی ؟

---

۱ ۔ مولانا ابوالکلام آزاد : غبار خاطر ، ص ۲۸۲ ۔

۲ ۔ بختاور خان ، مرأة العالم (لاہور ۱۹۷۹ء) ، ج ۲ : ص ۳۱۵ ۔

اسے سن کر میران جی پر وجد طاری ہو گیا اور وہ بیخود ہو کر دیواروں کے ساتھ ٹکریں مارنے لگے[۱]۔

اصلاحات کا دور

اورنگ زیب کے دل میں حضرت مجدد الف ثانیؒ (م ۱۶۳۴ء) کے فرزندوں، خواجہ محمد سعید اور خواجہ محمد معصوم کا بڑا احترام تھا۔ اس نے مؤخرالذکر بزرگ سے یہ درخواست کی تھی کہ وہ اس کے ساتھ رہا کریں، لیکن انھیں حضرت مجدد الف ثانیؒ نے یہ وصیت کی تھی کہ بادشاہوں کی صحبت اختیار نہ کریں، اس لیے انھوں نے معذرت چاہی۔ جب بادشاہ نے اصرار کیا تو خواجہ محمد معصوم نے اپنے فرزند خواجہ سیف الدین کو بادشاہ کے پاس بھیج دیا۔ محمد ساقی مستعد خان لکھتا ہے کہ اورنگ زیب نے لال قلعہ کے اندر ان کے رہنے کا انتظام کیا تھا۔ بادشاہ حکومت کے کاروبار سے فارغ ہو کر رات کے وقت ان کی خدمت میں حاضر ہوتا اور ان کی نگرانی میں سلوک کی منزلیں طے کرتا تھا[۲]۔ اورنگ زیب نے ان کی ترغیب پر اپنی مملکت میں شرعی اصلاحات نافذ کیں۔ خواجہ سیف الدین کے مکتوبات ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب، سابق صدر شعبۂ اردو، سندھ یونیورسٹی، حیدر آباد کی سعی و کاوش سے طبع ہو چکے ہیں۔ ان کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب اپنے والد بزرگوار کو بادشاہ کی روحانی ترقی کے بارے میں برابر مطلع کرتے رہتے تھے۔ اسی طرح خواجہ محمد معصوم سرہندی کے خواجہ سیف الدین کے نام مکتوبات

۱۔ الطاف حسین حالی، مقدمہ شعر و شاعری (مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ) ص ۱۴۔

۲۔ محمد ساقی مستعد خان، مآثر عالمگیری، ص ۸۴۔

۳۔ مکتوبات سیفیہ (سعید آرٹ پریس، حیدر آباد سندھ) مکتوب نمبر ۲، ص ۱۱۔

میں بادشاہ کی روحانی ترقی پر اطمینان اور تشکر کا اظہار کیا گیا ہے[۱] ۔

نقشبندیہ سلسلۂ تصوف کے بزرگ سماع سننے سے احتراز کرتے تھے اور ایسی محافل میں جانا بھی گناہ سمجھتے تھے ۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک بار حضرت شاہ غلام علی دہلویؒ کو ایک چشتی بزرگ نے محفلِ سماع میں شرکت کا دعوت نامہ بھیجا تو انھوں نے فرمایا :

> یا اللہ مجھ سے کون سی ایسی خطا سرزد ہوئی ہے کہ آج علی الصبح مجھے ایک مجلسِ بدعت میں مدعو کیا گیا ہے[۲] ۔

اورنگ زیب نے خواجہ سیف الدین سرہندی کے زیر اثر وزن جشن شمسی اور وزن جشن قمری کی تقاریب بند کر دیں ۔ اس لیے ان موقعوں پر جو راگ رنگ کی محفلیں منعقد ہوا کرتی تھیں، وہ بھی ختم ہو گئیں۔ محمد ساقی مستعد خان رقمطراز ہے کہ ۱۰۷۸ھ میں آخری بار خوشحال خان، بسرام خان ، رس بین اور بعض دوسرے موسیقار دربار میں باریاب ہوئے اور انھوں نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا ۔ شاہی دربار میں موسیقی کا یہ آخری مظاہرہ تھا ۔ اس کے بعد یہ باتیں خواب و خیال ہو کر رہ گئیں[۳] ۔

شاہی دربار سے نکالے جانے کے بعد موسیقار بھوکوں مرنے لگے ۔ یہ بات بھی اورنگ زیب کو پسند نہ تھی ۔ اس لیے وہ کبھی کبھی نامور موسیقاروں کو دربار میں شرف باریابی بخشتا اور گانا سنے بغیر انھیں کچھ دے دلا کر رخصت کر دیتا تھا ۔ ایک بار اس نے خوشحال خان اور اس کے ساتھیوں کو

---

[۱] ۔ مکتوبات خواجہ محمد معصوم ، (کراچی ۱۹۶۷ء) ، ج ۳ مکتوبات نمبر ۲۲۰ ، ۲۶۸ ۔

[۲] ۔ شاہ رؤف احمد ، درالمعارف ، استانبول ۱۹۷۵ء) ص ۸۷ ۔

[۳] ۔ محمد ساقی مستعد خان ، مآثر عالمگیری ، ص ۷۱ ۔

تین ہزار روپے اور خلعت عطا کیے[1] ۔

۱۶۶۹ء میں بادشاہ کی شمسی سالگرہ بڑی سادگی کے ساتھ منائی گئی ۔ اس سے قبل ایسے موقعوں پر بادشاہ کو قیمتی دھاتوں اور اناج کے ساتھ تولا جاتا تھا ، لیکن اس بار پابندی لگنے کی وجہ سے یہ تقریب بھی منعقد نہ ہوئی اور نہ ہی دربار میں موسیقاروں کو شرف باریابی ملا[2] ۔

شہزادہ محمد معظم کی شادی بڑے تزک و احتشام کے ساتھ ہوئی تھی ۔ اس کے برعکس شہزادہ محمد اعظم کی شادی بڑی سادگی کے ساتھ ہوئی ۔ تقریب نکاح میں قاضی عبدالوہاب ، سید محمد قنوجی ، ملا غوض وجیہہ اور خواجہ سیف الدین سرہندی موجود تھے[3]۔ اس لیے اس موقع پر کوئی بدعت نہیں ہوئی[4] ۔

اسی طرح شہزادہ محمد سلطان کی شادی بھی بڑی سادگی کے ساتھ ہوئی اور نکاح مسجد میں پڑھایا گیا[5] ۔

موسیقاروں کو رخصت کرنے کے بعد ایک روز مرزا مکرم خان صفوی بادشاہ سے ملا ۔ مرزا کو فن موسیقی پر عبور کامل تھا ۔ لہذا اس نے اسی موضوع پر بادشاہ سے گفتگو کی اور اس سے موسیقی کی حلت یا حرمت کے بارے میں سوال کیا ۔

بادشاہ نے جواب دیا کہ جو لوگ سماع سننے کے اہل ہیں ان کے لیے موسیقی سننا جائز ہے ۔ مرزا نے جھٹ کہا کہ بادشاہ خود بھی اسی زمرے میں شامل

---

۱ ۔ ایضاً ، ص ۷۹ ۔

۲ ۔ ایضاً ، ص ۸۱ ۔ (سرود سرایان و نغمہ پردازان از دولت دیدار محروم ماندند) ۔

۳ ۔ ایضاً ، ص ۱۰۹ ۔

۴ ۔ ایضاً ، ص ۷۸ ۔

۵ ۔ ایضاً ، ص ۱۲۴ ۔

ہیں۔ اس لیے انھیں موسیقی سننے سے احتراز نہیں کرنا چاہیے۔ اس پر بادشاہ نے کہا کہ وہ میزامیر کے بغیر اور خاص طور پر بکھاوج کے بغیر موسیقی سننا پسند نہیں کرتا اور یہ بات مسلم ہے کہ شریعت میں مزامیر کا استعمال ممنوع ہے۔ وہ چونکہ مزامیر کے بغیر موسیقی سننا پسند نہیں کرتا اس لیے اس نے موسیقی سننا ہی ترک کر دی ہے[1]۔

عہدِ اورنگ زیب میں فنِ موسیقی پر تصانیف

یہ بڑی ایک عجیب اتفاق ہے کہ فن موسیقی پر جتنی کتابیں اورنگ زیب کے عہد میں لکھی گئیں، اتنی اس سے پہلے کسی مغل حکمران کے دور میں نہیں لکھی گئیں۔ عالمگیری عہد میں راگ درپن کے علاوہ پانچ اور کتابیں اس فن لطیف پر منصۂ شہود پر آئیں۔ ان کے مخطوطے انڈیا آفس لائبریری لندن اور بوڈلین لائبریری آکسفورڈ میں محفوظ ہیں۔ ان میں سے ایک تصنیف جو بلا عنوان لکھی گئی ہے ۱۰۸۷ھ میں قلمبند ہوئی۔ اس کا متن ۲۲ اوراق پر پھیلا ہوا ہے۔ اس میں موسیقی کے بارہ مقاموں اور ۲۴ شعبوں کا ذکر کیا گیا ہے[2]۔

دوسرا مخطوطہ جو معرفتہ النغم کے نام سے موسوم ہے، ابو الحسن قیصر کا تحریر کردہ ہے[3]۔ یہ وہی مصنف ہے جس کا مجموعۂ کلام ”دیوان قیصر“ کے عنوان سے انڈیا آفس لائبریری لندن میں محفوظ ہے۔ معرفة النغم ۱۰۷۵ھ میں مکمل ہوئی۔ اس کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے:

> ”الحمد الصانع العالم و مبدع الخلاق من العدم و الصلوٰۃ علیٰ رسول المعظم سید العرب والعجم اما بعد، چنین گوید بندۂ احقر ابو الحسن المتخلص بہ قیصر“۔۔۔ الخ

---

[1] ایضاً، ص ۵۲۷۔

[2] زخاؤ، فہرست مخطوطات فارسیہ، بوڈلین لائبریری آکسفورڈ، مخطوطہ نمبر ۱۸۵۰۔

[3] ایضاً۔ دونوں رسالوں کا ایک ہی نمبر ہے۔

معرفۃ النغم کا متن ۴۷ اوراق پر پھیلا ہوا ہے ۔

عوض محمد کامل خانی، عالمگیری عہد کا ایک نامور موسیقار تھا ۔ اس نے اپنے دوستوں کی فرمائش پر فنِ موسیقی پر ایک رسالہ بعنوان "رسالہ در عمل بین و ٹھاٹھ راگہای ہندی" ۱۶۶۸ء میں تحریر کیا تھا ۔ اس کا ایک مخطوطہ بوڈلین لائبریری آکسفورڈ میں محفوظ ہے ۔ اس مخطوطہ کے ۱۲۳ اوراق ہیں[1] ۔ اسی فاضل مصنف نے "رسالۂ کامل خانی" کے عنوان سے فنِ موسیقی پر اپنی ایک اور یادگار چھوڑی ہے ۔ اس رسالے کا متن ۱۳۶ اوراق پر پھیلا ہوا ہے اور اس میں مصنف نے مختلف ساز بجانے کے بارے میں ہدایات درج کی ہیں[2] ۔

عوض محمد کامل خانی کا بیٹا مرزا ابو الخیر بھی اورنگ زیب کے عہد میں ایک نامور موسیقار گذرا ہے ۔ "رسالۂ کامل خانی" کی تحریر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے ۱۰۷۸ھ میں "تعین مخارجِ نغمات" کے عنوان سے جدولیں تیار کی تھیں[3] ۔

انڈیا آفس لائبریری لندن میں "شمس الاصوات" کے عنوان سے ایک نادر مخطوطہ موجود ہے ۔ اس کے مصنف کا نام متن میں مذکور نہیں ۔ یہ رسالہ، جس کے چھ ابواب اور ۳۳ اوراق ہیں ۱۶۹۷ء/۱۱۰۹ھ میں لکھا گیا تھا ۔ اس کا سال تصنیف ۔ جای نغمہ ۔ سے برآمد ہوتا ہے[4] ۔

راگ درپن کا ذکر پچھلے صفحات پر آ چکا ہے ۔ یہ کتاب اس لحاظ سے بڑی اہم ہے کہ اس عہد کے گویوں اور سازندوں کے بارے میں جو معلومات

---

۱ ۔ زخاؤ، کتاب مذکورہ بالا، مخطوطہ نمبر ۱۸۴۸ ۔

۲ ۔ ایضاً، مخطوطہ نمبر ۱۸۴۹ ۔

۳ ۔ ایضاً، ص ۱۰۶۷ ۔

۴ ۔ ایتھے، فہرست مخطوطات فارسیہ انڈیا آفس لائبریری لندن، مخطوطہ نمبر ۱۰۲۲ ۔

سیف خاں نے فراہم کی ہیں وہ اور کہیں نہیں ملتیں ۔ اگر یہ کتاب نہ ہوتی تو ہم بہت سے عظیم فنکاروں کے ناموں سے بھی آشنا نہ ہوتے ۔

عالمگیری عہد میں موسیقی کے مراکز

اورنگ زیب کے عہد میں کرناٹک ، تلونڈی ، آگرہ ، بلگرام اور گوالیار موسیقی کے بڑے مرکز متصور ہوتے تھے۔ اکبر اور شاہجہان کے دربار کے اکثر و بیشتر گویے گوالیار ہی سے تعلق رکھتے تھے۔ گوالیار میں میاں تان سین اور اس کے فرزند بلاس خان کی قبروں پر بیٹھ کر موسیقار گھنٹوں ریاض کیا کرتے تھے اور یہ روایت آج تک قائم ہے ۔

اودھ میں بلگرام موسیقی کا گہوارہ سمجھا جاتا تھا ۔ ابو الفضل نے آئین اکبری میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ بلگرام کے باشندے اپنی فہم و فراست میں مشہور اور موسیقی کے دلدادہ ہیں[1] ۔ اورنگ زیب کے عہد میں سید نظام الدین مدھ نائک جیسے امام فن کا قیام بلگرام ہی میں تھا ۔

مشرقی پنجاب میں تلونڈی (ضلع لدھیانہ) موسیقی کا گہوارہ سمجھا جاتا تھا ۔ (ان دنوں یہ قصبہ ”رائے دا کوٹ“ کہلاتا ہے) اس قصبے کی خاک پاک سے بڑے بڑے ماہرین فن اٹھے جنھوں نے موسیقی کی نوک پلک سنوارنے اور اسے بام عروج تک پہنچانے میں اپنا خون پسینہ ایک کر دیا تھا۔ رحیم داد ڈھاڈی ، جس نے شاہجہان کے فرزندوں اور اس کے بھائیوں کو موسیقی کے زیر و بم سے متعارف کرایا تھا ، تلونڈی ہی کا رہنے والا تھا[2] ۔ صوفی بہاء الدین برناوی کا شمار شاہجہانی عہد کے چوٹی کے موسیقاروں میں ہوتا ہے موصوف ترانہ و خیال بہت اچھا گاتے تھے اور رباب و بین امرتی بجانے میں ان کا کوئی ہمسر نہ تھا ۔ انہوں نے ۲۵ سال دکن میں رہ کر کرناٹک کی موسیقی سے واقفیت حاصل کی تھی[3] ۔ ان کے ذریعے کرناٹک کی موسیقی شمالی ہند میں متعارف ہوئی

---

۱ - ابو الفضل ، آئین اکبری (کلکتہ ۱۸۷۲ء) ، ج ۱ ، ص ۴۳۲ -

۲ - آغا صادق ، ماہنامہ قند مردان، موسیقی نمبر مئی جون ۱۹۶۰ء، ص ۶۱-

۳ - سیف خاں ، راگ درپن ، ص ۶۸ -

اور یوں دکن کا اثر شمالی ہند کے موسیقی کے مراکز تک پہنچا ۔

مغلوں کا دارالحکومت ہونے کی وجہ سے آگرہ موسیقی کا بڑا اہم مرکز بن گیا تھا اور ملک بھر سے ماہرینِ فن وہاں آ کر بس گئے تھے ۔ شیخ شیر محمد، ان کا بھائی پوجا ، ولی ڈھاڈی ، میاں ڈالو ڈھاڈی ، ابو الوفا طنبورہ نواز ، سید طیب بڈھا ، دھرم داس کلاونت اور صالح ربابی آگرہ کی سرزمین ہی میں پیوند خاک ہوئے ۔ ان کی کوششوں سے آگرہ موسیقی کا باقاعدہ گھرانہ (دبستان) بن گیا ۔

سندھی زبان کے مشہور شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائی (م۱۷۵۲ء) کی جوانی کا زمانہ اورنگ زیب کے عہد میں گذرا تھا ۔ شاہ صاحب نے اپنے کلام کو مختلف راگوں میں مرتب کر کے عوام تک پہنچایا ۔ سندھی موسیقی نے اسی زمانے میں جنم لیا اور آج تک شاہ عبداللطیف کا کلام حال و قال کی محفلوں میں ان ہی کی مرتب کردہ دھنوں میں گایا جاتا ہے ۔

اورنگ زیب کی وفات کے فوراً بعد موسیقی کا عروج

اورنگ زیب کے آنکھیں بند کرتے ہی شاہی دربار میں موسیقاروں کی آمد و رفت شروع ہو گئی ۔ اس کا جانشین شاہ عالم بہادر شاہ (۱۷۱۲ء ۔ ۱۷۰۷ء) کاروبار حکومت سے اس قدر لاپرواہ ہو گیا کہ لوگ اسے ”شاہ بے خبر“ کہنے لگے[1] ۔ وہ موسیقی کا بڑا دلدادہ تھا اور اس کی مجلس میں نامی گرامی گویے موجود رہتے تھے ۔ نعمت خان ، جو سدا رنگ کے لقب سے مشہور ہوا ، شاہ عالم اول کا درباری گویا تھا ۔ وہ دھرپد ، خیال اور ترانہ گانے میں اپنی نظیر آپ تھا[2] ۔

---

[1] ۔ خافی خان ، منتخب اللباب ، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۳ء ، ج ۴ ، ص ۸۱ ۔

[2] Abdul Halim, Essays On History of Indo- Pak Music, Dacca, 1962, p. 91.

شاہ عالم بہادر شاہ اول کی وفات کے بعد اس کا بیٹا معز الدین جہاندار شاہ (۱۷۱۲ء - ۱۷۱۳ء) تخت نشین ہوا۔ بقول خافی خان اس کا زمانہ ظلم و ستم اور فسق و فجور کا زمانہ تھا۔ گانے بجانے کی محفلیں جمنے لگیں اور قوال، کلاونت اور ڈھاڈی گھروں سے نکل آئے۔ جہاندار شاہ نے ایک بازاری عورت لعل کنور کو اپنے حرم میں ڈال لیا اور وہ شاہی محل میں نور جہاں اور ممتاز محل کی ہمسری کرنے لگی۔ اس کے رشتہ دار، جو پیشہ ور گویے تھے، چار ہزاری اور پنج ہزاری منصب پانے لگے۔ لعل کنور کا بھائی خوشحال خان آگرے کا گورنر مقرر ہوا۔ جہان دار شاہ کے وزیر اعظم ذوالفقار خان نے اس کی تقرری کا فرمان تیار کرنے میں تاخیر کی تو لعل کنور نے بادشاہ سے اس کی شکایت کی۔ جہاندار شاہ نے ذوالفقار خان سے تاخیر کا سبب دریافت کیا، تو اس نے کہا: "ہم خانہ زادوں کو رشوت کی لت پڑ گئی ہے، لعل کنور سے کہیے کہ وہ ایک ہزار طبلے بھجوا دے، اس کا کام ہو جائے گا"۔ بادشاہ نے ہنستے ہوئے اس کی وجہ پوچھی تو ذوالفقار خان نے کہا: "جب طبلے اور سارنگیاں بجانے والے بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہوں گے، تو پھر ہم خانہ زاد طبلے اور سارنگیاں بجا کر ہی اپنی زندگی بسر کریں گے"[1]۔

جہاندار شاہ کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ اس نے ایک سال کے عرصے میں ایک کروڑ روپیہ موسیقاروں پر خرچ کیا تھا۔

جہاندار شاہ کے قتل کے بعد حکومت کے تمام اختیارات سید برادران کے ہاتھ میں آ گئے اور انہوں نے یکے بعد دیگرے کئی شہزادوں کو تخت شاہی پر بٹھایا اور اپنی مطلب براری کے بعد انہیں ٹھکانے لگا دیا۔ بالآخر ۱۷۱۹ء میں شاہ عالم بہادر شاہ اول کا پوتا محمد شاہ تخت نشین ہوا۔ اس کا زیادہ تر وقت ناچ اور گانے کی مجالس میں گذرتا تھا اور اسی بنا پر اس کا لقب "رنگیلا" پڑ گیا۔ اس کے عہد حکومت (۱۷۱۹ - ۱۷۴۸ء) میں موسیقی کو بہت عروج ہوا اور بہت سے گویوں نے اپنے فن کا لوہا منوایا۔ انہوں نے "محمد شاہ پیا سدا رنگیلے" کے نام پر کئی راگنیاں تیار کیں۔

۱۔ خافی خان، منتخب اللباب، ج ۲، ص ۱۴۰ - ۱۳۹۔

اگر اورنگ زیب کے عہد میں بقول منوچی موسیقی کے مردود مردے کو گہری قبر میں دفن کر دیا گیا تھا ، تو اورنگ زیب کی آنکھیں بند ہوتے ہی اتنے نامی گرامی گویے کہاں سے شاہی دربار میں پہنچ گئے ؟ یہ درست ہے کہ شاہی دربار میں موسیقی کے مظاہرے بند ہوگئے تھے لیکن شاہی سرپرستی کی کمی امراء نے پوری کر دی۔ سیف خان اور اسد خان جیسے امراء موسیقاروں کی تربیت کرتے رہے اور یہ فن اورنگ زیب کے عہد میں نہ صرف زندہ رہا ، بلکہ ترقی کرتا رہا ۔

فضا یہ نغموں سے بھر گئی ہے کہ موج دریا ٹھہر گئی ہے
سکوت نغمہ بنا ہوا ہے وہ جیسے کچھ گنگنا رہے ہیں

(جگر مراد آبادی)

ضروری تصحیح

صفحہ ١٦ پر درج شعر کا پہلا مصرع یوں پڑھیے گا ۔

سگے دنبال آں محمل طفیل اُو رواں من ہم

◆

ذخیرہ

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

(غالب)